مشکلاتِ غالبؔ

نیاز فتحپوری

قیمت

دو روپیہ آٹھ آنے

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

فون نمبر ۲۳۵۸۹

ناشر:- عزیز الرحمٰن

پرنٹر:- نظامی پریس لکھنؤ

مُشکلاتِ غالبؔ

غالبؔ کے یہاں اتنے مختلف رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس کے دیوان کو زنجیر فرض کر لیں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئے گی اور کوئی کڑی کسی رنگ کی۔

اس کے یہاں تصوف و حکمت بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی۔ خالص عاشقانہ رنگ بھی ہے اور رندانہ شوخی و بے باکی بھی۔ بلندیٔ تخیل بھی ہے اور سطحی نقاشی بھی —— گویا وہ ایک گلدستہ ہے مختلف رنگ کے پھولوں کا جس میں ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق و پسند کا پھول مل جاتا ہے اور غالباً یہی سبب اس کے قبول عام کا ہے۔

غالبؔ کا نام سنتے ہی اس کی مشکل پسندی و دقیق نگاری ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس میں شک نہیں، وہ فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا بڑا مشکل پسند انسان تھا اور بیان کے نئے زاویے تلاش کرنے کے لئے اس کا خیال ہمیشہ دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گذر کر سامنے آتا تھا، حتے کہ وہ اپنے سہل و سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گرہ ضرور چھوڑ جاتا تھا، چہ جائیکہ حکمت و تصوف کے دقیق اشعار کہ انھیں تو معنوی نزاکت اور ندرتِ خیال کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا حالیؔ کو بھی یادگار غالبؔ میں اس کے بعض اشعار کی شرح کرنا

پڑی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہ ہوا یہاں تک کہ کلامِ غالبؔ کی متعدد شرحیں وجود میں آگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ شارحین غالبؔ نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے — بعض نے لفظی و لغوی تحقیق کو سامنے رکھا بعض نے اس عقیدہ کی بناء پر کہ غالبؔ کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں، اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالبؔ کا ہر شعر، حکمت و فلسفہ نظر آیا اور اس کی شرح و تفسیر میں وہ غالبؔ سے زیادہ ناقابل فہم ہو کر رہ گئے۔ بعض شرحوں میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں ضرورت سے زیادہ اطناب۔ اس لئے ان تمام شرحوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک معتدل قسم کی شرح کی ضرورت یقیناً باقی تھی اور بعض احباب نے مجھ سے ایسی شرح لکھنے کی بارہا خواہش بھی کی۔ لیکن میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

اس دوران میں اکثر طلبہ میرے پاس آئے اور انھوں نے غالبؔ کے بعض اشعار کا مفہوم مجھ سے دریافت کیا تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کے اساتذہ نے جو مفہوم ان کو بتایا ہے وہ بہت الجھا ہوا ہے اور طلبہ کا ذہن و دماغ آسانی سے اسے قبول نہیں کر سکتا۔ بنابراں مجھے خیال ہوا کہ غیر ضروری مباحث میں الجھے بغیر اگر سادہ الفاظ میں غالبؔ کے مشکل اشعار کا مفہوم ظاہر کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

نیازؔ

غزل

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش :۔ نگار خانۂ عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

شوخیِ تحریر :۔ شوخیٔ نقش، یعنی نقاش کی اُپج۔

کاغذی پیرہن :۔ ناپائیدار لباس، جس سے مراد ہے ہستیٔ ناپائیدار (اس میں رعایت اُس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرنے جاتا تھا)۔

کس کی :۔ سوالیہ نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال ہوا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ :۔ اس نگار خانۂ عالم کی ہر ہر چیز، نقاشِ ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبانِ حال سے اپنی نا استواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔

یہ شعر حمد کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار، جملہ موجوداتِ عالم فنا پذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کو ثبات نہیں۔

۲۔ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو :۔ کھودنا۔ کاوش۔ غیر معمولی محنت۔

سخت جانی :۔ انتہائی تکلیف جھیل جانے کی اہلیت۔

جوئے شیر لانا :۔ اشارہ ہے فرہاد کے قصہ کی طرف کہا جاتا ہے کہ شیریں نے اُسے پہاڑ

کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے کا حکم دیا تھا۔
مفہوم یہ ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف کے عالم میں تنہائی کی راتیں بسر کر رہے ہیں وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔
"کاو کاو" "سخت جانی" "صبح" اور "جوئے شیر" میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔
یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرتِ بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
دمِ شمشیر:۔ تلوار کی دھار۔
دم:۔ سانس۔
مفہوم یہ ہے کہ میرے شوقِ شہادت کا جذبۂ بے اختیار دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لئے بے اختیار ہو گئی اور اس کا دم باہر آ گیا۔
"دم باہر آنا" بے اختیار ہو جانے کے مفہوم میں اردو کا محاورہ نہیں اور محض اختراع ہے غالب کی۔
اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قائم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دمِ شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔
اسے ایہام کی شاعری کہتے ہیں جو اب بالکل نامقبول ہے۔

۴۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
مفہوم یہ ہے کہ میرے اشعار سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ لیکن ان کا سمجھنا محال ہے۔ یعنی جس طرح جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی، اسی طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے اشعار کا مفہوم بھی نہیں آ سکتا۔

اسی مضمون کا ایک شعر غالب کا یہ ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

۵۔ بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا:۔ بیقرار ۔بیتاب
موئے آتش دیدہ:۔ وہ بال جسے آگ دکھا دی جائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا۔
مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ اسیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لئے میری زنجیر کا حلقہ موئے آتش دیدہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اس شعر کی بنیاد صرف لفظ آتش پر قائم ہے اور اگر آتش زیر پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ "بیقرار" رکھ دیا جائے تو شعر مہمل ہو کر رہ جائے۔
یہ شعر بھی ناپسندیدہ ایہام و رعایت لفظی کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔ لفظ حلقہ "ہر حلقہ" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے خالی نہیں۔

غزل (۲)

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

تنگی:۔ تنگی
تنگیٔ چشم:۔ بخل

بروئے کار آنا:۔ سامنے میدان میں آنا۔
یعنی قیس (مجنوں) کے سوا کوئی اور صحرا میں اُس کے مقابلہ کے لئے نہ آیا۔ یعنی صرف وہی ایک میدانِ عشق کا مرد تھا۔

اس کی توجیہ غالبؔ نے یہ کی کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا اور اس میں دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔

اس شعر کی بنیاد لفظِ تنگی پر قائم ہے اور اس سے کافی ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۲۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی :- پریشانی۔ پریشاں خاطری۔

نقشِ سویدا :- دل کا سیاہ داغ۔

دُود :- دھواں

نقش درست کرنا :- نقش پیدا کرنا۔

مفہوم یہ ہے کہ :- ہمارا داغِ دل محض ہماری پریشاں خاطری کا نتیجہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سرمایہ محض دود (دھواں) ہے جس کی آشفتگی ظاہر ہے۔ مدعا یہ کہ جب تک آشفتگی پیدا نہ ہو داغِ دل میسر نہیں آسکتا۔

۳۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

یہ شعر بھی غالبؔ کے اُن اشعار میں سے ہے جو باوجود سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اس میں سب سے زیادہ الجھن "زیان و سود" کے ذکر نے پیدا کر دی ہے کیونکہ "کسی سے معاملہ ہونا" یا باہم عہد و پیمان کی گفت و شنید" کا مفہوم رکھتا ہے اس سے اگر تجھ سے کا خطاب "محبوب" سے ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملۂ محبت اور عہد وفا پینے پر جھگڑ رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور سارا طلسم درہم و برہم ہو گیا لیکن اس صورت میں "زیاں تھا نہ سود تھا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر خطاب خُدا سے ہے تو مفہوم یہ ہو گا کہ کاروبارِ حیات

سے رابطۂ قدرت سمجھنے کی کوشش محض خواب وخیال ثابت ہوئی اور ہماری بےخبری دنا آگہی بدستور باقی رہی جو "سود وزیاں" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

۴۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتبِ عشق یا مکتبِ غم میں میری حیثیت اب بھی ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں۔ یعنی جس طرح مکتب کی ابتدائی تعلیم میں رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا بتائے گئے تھے اسی طرح میں اب بھی اُسی "رفت وبود" کا ابتدائی سبق لے رہا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ خبر نہیں کہ دل کسی وقت اپنے پاس تھا اور اب وہ چلا گیا ہے۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ننگِ وجود ہونا:۔ وجود کے لئے باعثِ شرم ہونا۔

مفہوم یہ ہے کہ:۔ میں اپنی زندگی کے ہر رنگ میں وجود کے لئے باعثِ شرم تھا اور کسی لباس میں میرے عیوب چھپ نہ سکتے تھے۔ اس لئے اچھا ہوا کہ میں مر گیا اور کفن نے داغِ عیوب کو ڈھانپ لیا۔

۶۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رُسوم وقیود تھا

سرگشتۂ خمار:۔ متوالا

رُسوم وقیود:۔ دنیا کی پابندیاں

مفہوم یہ ہے کہ:۔ کوہکن (فرہاد) رسوم ظاہری کا پابند تھا کہ اُس کو مر جانے کے لئے سر پر تیشہ مارنے کی ضرورت ہوئی۔ ہماری محبت فرہاد سے زیادہ بلند ہے اور جان دینے کے لئے ظاہری اسباب کی محتاج نہیں۔

غزل (۳)

۱- کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا　　دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

ہم نے مدعا پایا :- ہم تمھارا مطلب سمجھ گئے

مفہوم یہ ہے کہ دل ہمارے پاس کہاں۔ وہ تو تمھارے ہی پاس ہے اور ازراہِ شوخی یہ کہتے ہو کہ اگر پڑا پایا تو نہ دیں گے۔

۲- عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

درد　درد سے مراد "دردِ زندگی" ہے

مُدّعا یہ کہ جب تک محبت نہ کی تھی۔ زندگی درد تھی۔ اب اس کی جگہ دردِ محبت نے لے لی جس کی کوئی دوا نہیں۔

۳- سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری　　حُسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا

حُسن کی ظاہری سادگی و بے پرواہی پر نہ جاؤ۔ یہ دراصل ہوشیاری ہے اور اس طرح وہ امتحان لینا چاہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس کی بے پرواہی دیکھ کر عشاق اپنی حد سے آگے بڑھ جائیں۔

غزل (۴)

۳- میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

جب میں حالتِ عدم میں تھا تو اُس وقت بھی میری "آتش نفسی" کا یہ عالم تھا کہ میری

آہ سے عنقا کے پر جل جاتے تھے۔ (عنقا ایک فرضی طائر ہے) لیکن اب تو میں دریائے عدم سے بھی بہت دُور آگے نکل گیا ہوں۔ اس لئے اب اس عالم کا ذکر نہ کرو۔ جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مرتبہ "فنائیت" نام صرف معدوم ہو جانے کا نہیں بلکہ اس سے بھی آگے گذر جانے کا ہے۔

صوفیہ کے یہاں درجۂ "ترکِ ترک" بھی قریب قریب یہی مفہوم رکھتا ہے۔

۴۔ عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اندیشہ بمعنی فکر و خیال استعمال کیا گیا ہے

مدعا یہ کہ میں اپنے فکر و خیال کی گرمی کا کیا بیان کروں۔ گرمی کا تو یہ عالم ہے کہ میں نے صحرا کا محض تصور ہی کیا تھا کہ اُس میں آگ لگ گئی۔ مبالغہ ہے لیکن گوارا!۔

غزل (۵)

۱۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ یعنی بہر رنگ، ہر طرح

شوق بہ معنی عشق استعمال کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ عشق خواہ کسی رنگ میں سامنے آئے، ساز و سامان سے متنفر نظر آئے گا یہاں تک کہ جب قیس (مجنوں) کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ بھی عریاں و برہنہ (ساز و سامان

سے بے نیاز) کھینچی جاتی ہے۔

۳۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا

"تنگیٔ دل" کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی میری تنگیٔ دل (رنج وملال) کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اُس کے اندر سے نکلا تو پَر دل سمیت نہ نکل سکا اور دل ہی میں چھوڑ گیا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تیر تنگیٔ دل کی داد دیتا اور زخم کو وسیع کر دیتا۔

مدعا یہ کہ میں ایسا دل تنگ (رنجیدہ وملول) انسان ہوں کہ محبوب کا تیر کھانے کے بعد بھی میری دل تنگی نہیں جاتی۔ اس شعر کی بنیاد محض لفظ تنگی پر قائم ہے۔ اگر اس کو نکال دیجئے تو شعر بے معنی ہو جائے۔

۴۔ دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب ودنداں نکلا

مائدہ:۔ دسترخوان

بقدرِ لب ودنداں:۔ یعنی محض اس حد تک کہ صرف لب ودنداں لذت حاصل کر سکیں۔

مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا دلِ حسرت زدہ تو لذتِ درد کا ایک کھلا ہوا وسیع دسترخوان تھا جس سے کافی لذت حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن لوگوں نے اُس سے صرف "بقدر لب ودنداں" یعنی بہت کم فائدہ اٹھایا۔ یعنی میرے کلام کو جس نظرِ غائر سے دیکھنا چاہیئے تھا لوگوں نے نہیں دیکھا اور اس کے محاسن کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

۵۔ اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

"ہمتِ دشوار پسند" سے خطاب ہے اور "نو آموز فنا" اُس کی صفت ہے۔ یعنی ایسی

ہمتِ دشوار پسند جو نو آموزِ فنا بھی ہے۔ "ہمتِ دشوار پسند" سے مراد وہ ہمت و حوصلہ ہے جو دشواریوں سے گزرنا پسند کرے۔ اور "نو آموزِ فنا" سے مراد ہے "فنا کی منزل کا تجربہ نہ رکھ کر اول اول اس سے گزرنے والا۔"

غالب اپنی "ہمتِ دشوار پسند" کو جو "نو آموز" بھی ہے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو باوجود نو آموز ہونے کے اپنی دشوار پسندیوں کی بدولت منزلِ فنا کی دشواریوں سے باآسانی گزر گئی اس لئے بتا کہ اب میں کیا کروں اور فنا سے زیادہ اور کون سی مشکل منزل ڈھونڈھ نکالوں کہ تیری دشوار پسندی کے حوصلے پورے ہوں۔

۶۔ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لفظ "پھر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی گریہ کیا گیا تھا لیکن کوئی قطرۂ اشک دل میں رہ گیا تھا اور اب اس قطرہ نے ایسا زور باندھا کہ طوفان بپا کر دیا۔

غزل (۶)

۱۔ دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

بابِ نبرد :۔ مقابلہ کرنے کا اہل۔
نبرد پیشہ :۔ جنگ و مقابلہ کا شائق۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ میدانِ محبت میں انھیں لوگوں کو آنا چاہئیے جو سختیاں برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ اس کے اہل نہیں جو ابتدائی دشواریوں ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عشق کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لئے بڑا کلیجہ چاہئیے۔

۲۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

زندگی میں بھی ہر وقت موت کے کھٹکے سے میرا رنگ زرد رہتا تھا۔ یعنی کاروبارِ حیات میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا' یہ تمام اسباب زندگی فنا ہونے والے ہیں اور جس چیز کو بقا نہ ہو اُس پر خوش ہونا کیا؟

۳۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں — مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فرد فرد :۔ منتشر' بے ربط۔

یعنی اس وقت بھی جب محبت کے متعلق میرے خیالات اوراق پریشاں کی حیثیت رکھتے تھے اور میں اُس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ تھا' جذبۂ وفا کا قائل تھا' اس لئے اب کہ میں ابتدائی منزل سے گزر گیا ہوں' میری وفاداری اور خوئے تسلیم و رضا کی پختگی کا کیا کہنا۔

غزل (۷)

۱۔ شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

سُبحہ :۔ تسبیح کو کہتے ہیں جس میں عموماً سو دانے ہوتے ہیں۔ میرے محبوب کو تسبیح ہاتھ میں لئے رہنا اس لئے پسند ہے کہ اس طرح وہ گویا ایک ہی وقت میں سو دل اُڑانے کا سماں سامنے لے آتا ہے۔ غیر دلچسپ خیال آرائی کے سوا اس میں کچھ نہیں۔

۲۔ بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

فیض بیدلی :۔ حسرت و مایوسی کا فیض یا صدقہ۔

نومیدیٔ جاوید:۔ ناکامیٔ دائم۔

مطلب یہ تھا کہ ہماری زندگی بڑی سخت گتھی تھی لیکن ہماری یا یوسی نے زندگی کی تمام ناکامیوں کو آسانی سے جھیل کر اس کو آسانی سے سلجھا دیا اور کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل اس لئے پسند آیا کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں اسے کسی کاوش سے کام لینا نہیں پڑا اور خود ہماری فطرت ہی نے اس کو حل کرلیا۔

۳۔ ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

قاتل کا سیرِ گل کی خواہش کرنا، اس کی بے مہری کا ثبوت ہے کیونکہ جب وہ پھول کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ کوئی بسمل اپنے خون میں لوٹ رہا ہے۔

۴۔ جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

تحفہ، ارمغاں اور ہدیہ کا ایک مفہوم ہے۔

الماس:۔ ہیرا۔ اس کے ٹکڑے زخم کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

"غمخوارِ جانِ دردمند" سے مراد محبوب ہے۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اے اسدؔ مبارک ہو کہ تمھارا محبوب جو تمھاری غمخواری کے لئے آیا ہے وہ جراحت، الماس اور داغِ جگر کے تحفے بھی اپنے ساتھ لایا ہے جو تمھیں مرغوب ہیں یعنی وہ آیا تو تھا غمخواری کے لئے لیکن پہلے سے زیادہ تمھیں مجروح و دردمند بنا گیا۔

اگر غمخوار سے مراد ناصح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی نصیحتوں سے میری دردمندیاں اور بڑھ گئیں۔

غزل (۸)

۲۔ سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے اور کاکل کو افعی سے۔ یعنی تیرا سبزۂ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیرے کاکل کی زہر افشانیاں کم نہ ہوئیں۔

مشہور ہے کہ زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے لیکن کاکل کا افعی ایسا سخت افعی ہے کہ اس زمرد کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مدعا یہ کہ سبزۂ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیری زلف کاکل کی زہر افشانی کا عالم وہی ہے۔

۷۔ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اس شعر میں غالبؔ نے اپنی انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوبِ عیسیٰ نفس میرے اندر نئی زندگی پھونکنے آیا تھا لیکن یہاں ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے افسونِ زندگی پڑھنے کے لئے لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ میں اس جنبش کے صدمہ سے مر گیا۔

مدعا یہ کہ میرا حال دعا اور دوا دونوں سے گذر گیا ہے اور میری جانبری کی کوئی صورت باقی نہیں۔

غزل (۱۹)

۱۔ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس شعر میں زاہد کے تصورِ جنت پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ جس چیز کو جنت سے تعبیر کرتا ہے

ہماری نظر میں ایک گلدستہ سے زیادہ نہیں اور گلدستہ بھی وہ جسے ہم طاقِ نسیاں کے سپرد کر چکے ہیں یعنی جس کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔

مدعا یہ کہ ہماری منزلِ عمل جنت کی طمع سے بہت بلند ہے اور ہمارا فلسفۂ زندگی یہ نہیں کہ کسی لالچ یا غرض سے کوئی اچھا کام کریں۔

۲۔ بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

مژگانِ یار کی کاوشِ ستم کا حال کیا بیان کیا جائے جب کہ اس نے ہمارے ہر قطرۂ خون کو تسبیحِ مرجاں کا دانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ (مرجان سُرخ ہوتا ہے)

اس لفظِ کاوش سے فائدہ اٹھا کر قطرۂ خوں کو دانۂ تسبیح ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ تسبیح کے دانے بھی سوراخ کر کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ شعر بھی محض الفاظ کا کھیل ہے اور ناگوار ندرتِ بیان۔

۳۔ نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت :۔ عیب۔

دانتوں میں تنکا لینا :۔ اظہارِ عجز و فرومایگی کو کہتے ہیں۔

بعض وحشی قبائل میں دستور تھا کہ جب دو مخالف قبیلے یکجا ہو جاتے تھے تو کمزور قبیلہ کا سردار قوی قبیلہ کے سردار کے پاس دانتوں میں تنکا دبا کر جاتا تھا جس سے مقصود اپنی عاجزی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔

مدعا یہ کہ میں قاتل کے سامنے اظہارِ عجز کے طور پر دانتوں میں تنکا لے کر گیا لیکن ہوا یہ کہ تنکا ریشۂ نیستاں

بن گیا یعنی بانسری کی طرح اُس سے نالے پیدا ہونے لگے اور قاتل کا رعب بھی مجھے اس سے باز نہ رکھ سکا۔

۶۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مضمر:۔ پوشیدہ۔
ہیولیٰ:۔ اصل مادہ
خونِ گرم:۔ محنت

میں اپنی تباہی کا گلہ کس سے کروں جبکہ خود میری ساخت اور تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے یعنی جس طرح دہقاں کا محنت کر کے خرمن جمع کرنا بجلی گرنے کا باعث ہے، اُسی طرح خود میرا وجود میری تباہی کا باعث ہے۔

۱۲۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ:۔ اُس لکیر یا نشان کو کہتے ہیں جو راہ گیروں کے نقشِ قدم سے راستے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

شیرازہ:۔ اُس تاگے کو کہتے ہیں جو کسی کتاب کے اوراق کو منسلک کر دیتا ہے۔

مدعا یہ کہ ہماری نگاہ میں اس بیز راہِ فنا کا جادہ ہے کیونکہ آخر کار اسی سے شیرازۂ عالم کے تمام اجزائے پریشاں منسلک ہو جاتے ہیں یعنی زندگی محض پریشانی و آشفتگی کا نام ہے اور مرتے دم تک اُن سے مفر نہیں لیکن مرنے کے بعد یہ سب انتشار ختم ہو جاتا ہے اور عالم کے تمام اجزائے پریشاں ایک ہو جاتے ہیں۔

جادہ اور شیرازہ میں فی الجملہ ظاہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

غزل (۱۲)

۱۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محرم :۔ آشنا، واقف۔
نواہائے راز :۔ عالمِ غیب کی صدائیں۔
اس شعر کی بنیاد لفظ حجاب پر قائم ہے جس کے معنی پردہ کے بھی ہیں۔
لوگ کہتے ہیں کہ علائق دنیا کے حجاباتِ حقیقت کے سمجھنے سے انسان کو باز رکھتے ہیں لیکن غالب کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، اگر انسان کے کان نواہائے راز اور عالمِ غیب کی صدا سے آشنا ہوں تو یہ حجابات بھی پردۂ ساز ہو جائیں اور اُن سے سرمدی نغمے پیدا ہونے لگیں۔

۲۔ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگِ شکستہ :۔ اُڑا ہوا رنگ۔ جب چہرہ کا رنگ اُڑتا ہے تو اُس میں سفیدی سی جھلک آتی ہے اسی لئے رنگِ شکستہ کو صبح سے تشبیہہ دی ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ میرے اُڑے ہوئے رنگ کا نظارہ معشوق کے لئے گویا وقتِ صبح کا نظارہ ہے جب عام طور پر پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں اس لئے میری رنگِ شکستہ کی صبح کو دیکھ کر محبوب کے گل ہائے ناز کو بھی کھلنا چاہیئے۔ یعنی میری شکستگیٔ رنگ کو التفاتِ محبوب کا باعث ہونا چاہیئے
اس شعر میں ناگوار تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں۔

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ باز:۔ وہ شعبدہ باز جو سر پر شیشہ رکھ کر رقص کرتا ہے اور شیشہ نہیں گرنے پاتا۔

مفہوم یہ ہے کہ شیشہ جس میں شراب بھری ہے جوشِ بادہ سے ہر طرف اچھل رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بساطِ مے خانہ کا ہر گوشہ گویا کہ شیشہ باز کا سر ہے جس پر شیشے اچھل رہے ہیں۔

نہ مفہوم لطیف، نہ تعبیر و استعارہ قابلِ تعریف۔

غزل (۱۳)

۳۔ گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

دیوانگی دُور کرنے کے لئے عموماً نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہر چند میں دیوانہ ہوں اور دوست بہ ظاہر ہاتھ میں نشتر لے کر آیا ہے تاکہ وہ فصد کھول کر میری دیوانگی دُور کرے، لیکن میں اس فریب میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ آستین کے اندر دشنہ (خنجر) بھی چھپائے ہوئے ہے اور اس کا مقصود فصد لے کر میری دیوانگی دور کرنا نہیں بلکہ دشنہ سے مجھے ہلاک کر دینا ہے۔

۵۔ ہے خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا

کہا جاتا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کے حُسنِ عمل کی جزا میں بہشت کا دروازہ

قبر میں کھل جاتا ہے۔ اس روایت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ میں تو صرف حسنِ یار کا تصور لے کر گور میں گیا تھا اور حسنِ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، پھر بھی خلد کا دروازہ کھل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ محض حسن کا تصور بھی بجائے خود بڑا حسنِ عمل ہے جس کی جزا میں خلد کا دروازہ میری گور کے اندر کھل گیا۔ ایک بلطف معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ حسن کا تصور ہی بجائے خود خلد آفریں ہے۔

۸۔ کیوں اندھیری ہے شبِ غم۔ ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا سوال ہے "شبِ غم اتنی تاریک کیوں ہے" خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ شبِ غم میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ان بلاؤں کا تماشہ دیکھنے کے لئے آج دیدۂ اختر اوپر ہی کی طرف مائل ہے زمین کا رُخ نہیں کرتا اور یہی سبب ہے شبِ غم کی اندھیری کا۔

یہ شعر دور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

۹۔ کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

کسی وقت دستور تھا کہ موت یا کسی حادثہ کی خبر جب کسی خط میں دی جاتی تھی تو اُسے بند نہ کرتے تھے بلکہ کھلا ہوا بھیجتے تھے۔ غالب نے اسی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مصائب کا اظہار کیا ہے کہ آج کل نامہ بر وطن سے جو خط لاتا ہے وہ کھلا ہوا لاتا ہے جس میں بری خبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

غزل (۱۴۳)

یہ غزل مسلسل ہے جس میں غالبؔ نے ایک طرف اپنے عالمِ فراق کی بیتابی و اضطراب فرطِ گریہ و اشک باری کا حال ظاہر کیا ہے اور دوسری طرف محبوب کے سرور و نشاط اور عالمِ استغنا کا۔

۱۔ شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

زہرۂ ابر آب تھا:۔ ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ رات میرے سوزِ دل کی برق پاشی کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہو گیا تھا اور اس میں جو بھنور پڑتے تھے وہ بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آتے تھے۔

اس شعر میں صرف شدّتِ اضطراب کا ذکر ہے اور وہ بھی حد درجہ ناگوار مبالغہ کے ساتھ جس میں محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ثبوت کوئی نہیں۔

۲۔ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

عناں گیرِ خرام:۔ مانعِ خرام۔

پنبۂ بالش:۔ تکیہ کی روئی۔

مفہوم یہ ہے کہ وہاں نہ آنے کے لئے ان کو یہ عذر تھا کہ بارش ہو رہی ہے اور یہاں بحالتِ مایوسی آنسوؤں نے وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ تکیہ کی روئی گویا کفِ سیلاب ہو کر رہ گئی۔

شعر میں ناگوار مبالغہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

تارِ نگہ کا نایاب ہونا: کچھ نظر نہ آنا۔
مفہوم یہ ہے کہ وہاں محبوب کے سنورنے کا یہ حال تھا کہ ایک ایک بال میں موتی پروئے جا رہے تھے اور یہاں بحالتِ انتظار فرطِ گریہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔
یعنی اُدھر بالوں میں موتی پروئے جا رہے تھے اور اِدھر تارِ نظر میں دُرہائے اشک!

۴۔ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

باغ میں سُرخ سُرخ پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جوئے آب میں چراغاں ہو رہا ہے اور یہاں مجبوری کا یہ عالم تھا کہ خون کے آنسو رونے سے فرصت نہ تھی۔

۵۔ یاں سرِ پُرشور بےخوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

دیوار جو:۔ دیوار ڈھونڈنے والا۔
یہاں بےخوابی میں بار بار جی چاہتا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا دیا جائے اور وہاں محبوب کے سکون و بےخبری کا یہ عالم تھا کہ کمخواب کے تکیہ پر سر رکھے ہوئے اطمینان سے سو رہا تھا۔

۶۔ یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بےخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

یہاں یہ عالم تھا کہ ہر ہر سانس سے بزمِ بیخودی کی شمع روشن ہوتی تھی اور وہاں اغیار کی صحبت سے لطف اُٹھانے کے لئے فرشِ گل بچھا ہوا تھا۔

۷۔ فرش سے تا عرش واں طوفانِ موجِ رنگ تھا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہاں زمین سے آسمان تک لطف و نشاط کا طوفان برپا تھا اور یہاں محض جلنا ہی جلنا۔

غزل (۱۵)

۱۔ نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

یعنی رات میرا دل تڑپ تڑپ کر نالے کر رہا تھا لیکن بالکل بے اثر گویا میرا اضطراب دانہ سپند کا سا اضطراب تھا اور اس سے مقصود وصلِ غیر کو نظرِ بد سے بچانا تھا۔

دستور ہے کہ نظرِ بد سے بچانے کے لئے آگ میں دانہ سپند ڈالتے ہیں جو چٹخ کر باہر آجاتا ہے۔ اس لئے نالۂ بے اثر کو سپند سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مقدمِ سیلاب :۔ سیلاب کی آمد
نشاط آہنگ :۔ مسرور
سازِ صدائے آب :۔ جلترنگ جس میں چینی کے پیالوں کے اندر پانی بھر کر لکڑی کی ضرب

سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔
سیلاب کی وجہ سے اپنے گھر کی تباہی پر میرا دل اس درجہ مسرور تھا کہ جو آواز گھر کے در و دیوار سے پیدا ہو رہی تھی وہ جلترنگ کا سا لطف دے رہی تھی۔

۳۔ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں!
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

اندیشہ :- خیال
سنجاب :- ایک قسم کا قیمتی سمور
مفہوم یہ ہے کہ :- خاکساری اور خاک نشینی کے زمانے میں جو نازِ استغنا مجھے حاصل تھا اس کا ذکر کیا کروں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بسترِ خاک نہیں بلکہ بسترِ سنجاب پر آسودہ ہوں۔

۴۔ کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

کچھ نہ کی :- یعنی کچھ نہ کیا۔
روکش :- مقابل
مفہوم یہ ہے کہ اپنا جنون ناقص و ناتمام تھا اس لئے اُس نے کچھ نہ کیا ورنہ صحرائے جنوں کا تو ذرہ ذرہ روکش آفتاب ہے اور اگر ہم اپنے جنون میں کامل ہوتے تو ہم بھی باوجود ذرہ حقیر ہونے کے آفتاب کا مقابلہ کرتے۔

۵۔ یاد کرو وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا انتظارِ صید میں ایک دیدۂ بیخواب تھا
محبوب سے کہتا ہے کہ وہ زمانہ یاد کر، جب شکار کی جستجو میں تیرے دام (جال) کا حلقہ

(پھندا) دیدۂ بیخواب کی طرح کھلا رہتا تھا لیکن اب یہ دور ختم ہوگیا ہے۔ کیونکہ تیرے دام میں اب اتنے صید آچکے ہیں کہ تجھے اب کسی تازہ شکار کی فکر ہی نہیں۔

۶۔ میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کثرتِ اشکباری کا اظہار انتہائی مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر میں غالبؔ کو رونے سے باز نہ رکھتا تو اتنا سیلاب برپا ہو جاتا کہ آسمان بھی ایسا نظر آتا گویا اس سیلاب کا کف (جھاگ) ہے۔

غزل (۱۶)

۱۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعت :- امانت۔

غالبؔ نے "دینا پڑا" کا مفہوم "دینا پڑے گا" ظاہر کیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ مدعا یہ ہے کہ خونِ جگر صرف مژگانِ یار کی امانت تھا اور اسی کے لئے یہ خون بہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے نتیجہ یہ ہوا کہ جب مژگانِ یار نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سرِ نو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا۔

۲۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

تمثال دار :- عکس پیدا کرنے والا

آبگینہ سے مراد آئینۂ دل

آئینہ اگر ٹوٹا ہوا نہ ہو تو اس میں ایک ہی عکس نظر آئے گا لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اُس کے ہر ہر ٹکڑے میں الگ الگ صورت نظر آئے گی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر غالبؔ کہتا ہے کہ تو نے میرا دل (جو تیری آرزو کا آئینہ دار تھا) ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہزاروں آرزوؤں کا ماتم دار بنا دیا۔

مدعا یہ کہ دل ٹوٹنے سے میری تمناؤں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

غزل (۱۷)

۴۔ جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

از بسکہ :- چونکہ

جوہرِ آئینہ اُن لکیروں کو کہتے ہیں جو صیقل کے وقت آئینہ میں پڑ جاتی ہیں۔

تیرا جلوہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہر وقت اُسی کو دیکھتی رہے اور تیرے اس تقاضائے جلوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خود جوہرِ آئینہ بھی مژگاں ہو جانے یعنی تجھے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے۔

جوہرِ آئینہ کو مژگاں سے تشبیہہ دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دیکھنا مژگاں کا کام ہے یا نگاہ کا، اگر یہ کہا جاتا کہ جوہرِ آئینہ بھی نازِ نگہ بن جانا چاہتا ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔

غزل (۱۸)

۱۔ شب خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شوقِ ساقی :- شوقِ آمدِ ساقی۔

رستخیز انداز ہ :۔ قیامت کے مانند

محیطِ بادہ :۔ خطِ ساغر یا خود ساغر مراد ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کا انتظار تھا اور اُس کے نہ آنے سے ہم پر خمار کی کیفیت طاری تھی لیکن یہ اس قیامت کی کیفیت تھی کہ مسلسل انگڑائیوں کی وجہ سے (جو لازمی نتیجہ ہیں خمار کا) خطِ ساغر یا خط شیشہ تک (یعنی تمام بزم بادہ میں) گویا ہنگامۂ قیامت کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ انگڑائیوں میں چونکہ ایک صورت ہنگامہ و تلاطم کی پائی جاتی ہے اس لئے اسے "رستخیز اندازہ" کہا گیا۔

غالبؔ کا یہ شعر دُور از کار تخیُّل کے سوا کچھ نہیں اور اگر دونوں مصرعوں کی ردیف "تھا" کو بود کر دیا جائے تو فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔

۲۔ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا

جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

دفترِ امکاں :۔ عالمِ موجودات و ممکنات۔

جادہ :۔ راستہ

اس شعر میں وحشت و جنون کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جب تک ہم نے دشتِ وحشت میں قدم نہ رکھا تھا ہم عالمِ امکاں کی حقیقت سے ناواقف تھے لیکن اس دشت میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ راہِ جنوں تو ایک ایسا شیرازہ ہے جس سے دونوں عالم کے اجزائ وابستہ ہو جاتے ہیں۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ بقاء و فنا کی حقیقت کا صحیح علم عقل و ہوش سے نہیں بلکہ وحشت و جنون ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

صحرا گرد:۔ مجنوں کی صفت ہے۔
وحشت خرامی:۔ وحشت وجنوں کی حالت میں چل پڑنا۔
مفہوم یہ ہے کہ مجنوں کا ٹھکانا تو صحرا تھا جہاں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کوئی اور روک ٹوک، پھر کیا وجہ تھی کہ لیلیٰ دیوانہ وار مجنوں تک نہ جا پہونچی۔
اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔
"گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا"

۴۔ پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

حسن کے استغناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسبابِ آرائش سے بے نیاز رہے،۔ مگر اس کے ہاتھوں میں مہندی اور رخسار پر گلگونہ لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسباب آرائش سے بے نیاز نہیں ہے جو حسن کی انتہائی رسوائی ہے۔

۵۔ نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

فارسی میں "چیزے را باد دادن" تباہ و برباد کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ ہمارے نالوں نے دل کے ٹکڑے برباد و منتشر کر دیئے حالانکہ نالہ کی یادگار یہی منتشر اوراقِ دل تھے اور اب بربادی دل کے بعد وہ یادگار بھی باقی نہ رہی۔
دوسرے مصرعہ میں یادگارِ نالہ کے بعد لفظ بھی محذوف ہے۔

غزل (۲۱)

اس غزل کے اکثر اشعار مومن کے رنگ کے ہیں۔

۱۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاطِ کار:۔ کام کرنے کا حوصلہ

کاروبارِ عالم کی رونق صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے اسی خیال کے زیرِ اثر ہر شخص مصروفِ کار رہتا ہے۔ اگر موت کا کھٹکا نہ ہو تو پھر یہ تمام ہنگامۂ دنیا ختم ہو جائے اور جینے کا کوئی لطف باقی نہ رہے۔

۲۔ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ۔۔۔ کہاں تک اے سراپا ناز "کیا کیا"؟

تجاہل پیشگی:۔ جان بوجھ کر انجان بننا۔

یہ جو تم میری ہر بات پر انجان شخص کی طرح "کیا کیا" کہا کرتے ہو (گویا کچھ جانتے ہی نہیں) تو اس سے آخر تمھارا کیا مطلب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے حال سے خوب واقف ہو اور تمھارا یہ بار بار کا سوال تجاہلِ عارفانہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں ۔۔۔ شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

دشمن پر آپ کی بیجا نوازشیں دیکھ کر اگر میں شکایتیں کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلہ کیوں ہے؟

شکایتوں کو رنگین اس لئے کہا گیا کہ اس کا تعلق محبوب اور غیر کے ربطِ رنگیں سے ہے۔

۴۔ نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ۔۔۔ تغافلہائے تمکیں آزما کیا

میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بالکل بے حجاب اور بے تکلف ہو کر ملو لیکن تم تغافل سے کام لیتے ہو جو میرے لئے سخت صبر آزما ہے

۵۔ فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

خس :- تنکا، گھاس پھونس

اہلِ ہوس کی محبت بالکل ایسی ہی ہے جیسے خس میں آگ لگادی جائے اور وہ دم کے دم میں بھڑک کر ختم ہو جائے اس لئے ایسی ناپائیدار محبت کرنے والے سے وفا کی امید رکھنا عبث ہے۔

۶۔ نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا

ہماری ہر سانس خود اپنے ہی دریائے بیخودی کی موج ہے اس لئے ساقی کے تغافل کی شکایت بیکار ہے کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بیخودی میں تو کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہائے صبا کیا

غالبؔ کا یہ شعر باوجود سادہ ہونے کے کافی الجھا ہوا ہے۔

عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لئے عطرِ پیراہن کے معنی "خوشبوئے لباس" کے ہوئے۔

"دماغ نہ ہونا" یعنی برداشت نہ ہو سکنا۔

سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیرہن مراد ہے؟ اپنا یا محبوب کا! بعض حضرات نے خود غالبؔ کا لباس قرار دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباسِ یار مُراد ہے اور غالبؔ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہنِ محبوب کی خوشبو کو ادھر ادھر لئے پھرتی ہے اور ہم کو

نہیں پہونچاتی تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو جب کہ خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اُٹھانے کی تاب نہیں۔

۸۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

جس طرح پانی کے ہر قطرہ کا (اس لحاظ سے کہ وہ سمندر ہی کا ایک جزو ہے) یہ دعویٰ کرنا کہ "سمندر ہوں" بیجا نہیں ہے، اسی طرح اگر ہم بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہم بھی اُسی کا ایک جزو ہیں۔

غزل (۲۳)

۱۔ اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

"جنوں جولاں گدا" اور "بے سر و پا" دونوں صفتیں گدا کی ہیں یعنی ایک بے سر و پا قسم کا جنون رکھنے والا۔

"پشت خار" پیٹھ کھجانے والا آلہ، لوہے یا کسی اور دھات کا بنا ہوا آلہ جس کے سرے پر پیٹھ کھجاتے کے لئے پنجہ بنا دیتے ہیں۔ اور فقرا اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم ایسے جنون زدہ فقیر ہیں کہ صحرا کے سوا ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں اور بے سر و پائی یا بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس پشت خار تک نہیں اور اس کا کام ہم پنجۂ مژگانِ آہو سے لیتے ہیں۔ یعنی کثرتِ صحرا نوردی سے، غزالانِ صحرا بھی ہم سے اس درجہ آشنا ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی پلکوں سے ہماری پیٹھ تک کھجا دیتے ہیں

غزل (۲۴)

۱۔ پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

ہماری شرم نارسائی الطافِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی تحفہ رکھتی ہے اور وہ تحفہ صرف اُس دعوائے پارسائی کا ہے جو سو سو طرح سے خون آلود (ناکام) ہے۔

یعنی خدا کے حضور میں ہم اعتراف گناہ کے سوا کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے اور ہماری یہی معذرت ممکن ہے عفو و درگزر کا سبب ہو سکے۔

۲۔ نہ ہو حُسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حُسن تماشا دوست :۔ وہ حُسن جو نمود و نمائش پسند کرتا ہے۔

رسوا بے وفائی کا :۔ اپنی بیوفائی کی وجہ سے بدنام

مفہوم یہ ہے کہ چونکہ حُسن "تماشا دوست" ہے اور اس نے ساری دنیا کو دعوتِ نظارہ دے دی ہے، اس لئے اس پر الزام بے وفائی قائم کرنا درست نہیں بلکہ اس طرح تو سیکڑوں تماشائیوں کی نگاہیں جو اس کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہیں اُس کے دعوائے پارسائی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں۔

۳۔ زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

شاعر محبوب سے درخواست کرتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے جلوہ کی زکوٰۃ مرحمت کر تاکہ اس کی روشنی سے ہمارا کاسۂ گدائی چراغِ خانہ کا کام دے۔ مدعا یہ کہ ہمارے تاریک دل کو بھی اپنے جلوہ سے روشن بنا دے۔

۴۔ نہ مارا جان کر بےجرم قاتل تیری گردن پر   رہا مانندِ خونِ بیگنہ حق آشنائی کا

اس شعر میں مصرع اول کے آخری ٹکڑے کو دوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے مطلب واضح ہوجاتا ہے۔ غالب اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میں تیرے پاس اس لئے گیا تھا کہ تو مجھے قتل کردے لیکن تو نے (یہ سمجھ کر کہ میں بے جُرم ہوں اور بے جُرم کو قتل کرنا اُس کا خوُن اپنی گردن پر لینا ہے مجھے قتل نہیں کیا۔ حالانکہ اس صورت میں تو نے مجھے قتل نہ کر کے حقِ دوستی کا خون کر دیا۔ کیونکہ حقِ دوستی یہی تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا۔

یہ شعر غالب نے مومن کے رنگ میں لکھا ہے اور پاکیزگی بیان کے لحاظ سے اُس کے بہترین اشعار میں شمار کیا جاتا ہے

۵۔ تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضہ شکوۂ بے دست و پائی کا

زبان کی تمنا یا تقاضہ یہ تھا کہ محبوب سے اپنی بے دست و پائی کا شکوہ کیا جائے لیکن جب اپنی بے زبانی (مجبوری و بیچارگی) نے اس کی اجازت نہ دی تو محبوب کو خود رحم آگیا اس لئے ہم کو دراصل اپنی بے زبانی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو حصولِ مدعا کا سبب بنی۔

۶۔ وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

مدعا یہ کہ میرا نفس (یعنی میری نوا) اور نکہتِ گل دونوں ایک ہی سے ہیں کیونکہ چمن میں بہار آتے ہی پھولوں کی خوشبو اور میری خوشنوائی دونوں ساتھ ساتھ شروع ہو جاتی ہیں۔

۷۔ دہانِ ہر بتِ پیغارہ جُو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

پیغارہ جُو:۔ طعنہ زن
اس شعر کے سمجھنے کے لئے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لیجئے ایک یہ کہ زنجیر کی کڑی دہن سے مشابہ ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ دہن معشوق کو شعراء اُس کی تنگی ظاہر کرنے کے لئے معدوم کہتے ہیں۔
شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی دہنِ معشوق ایسا نہیں جو تیری بے دفائی پر طعنہ زن نہ ہو اور اس طرح زنجیرِ رسوائی کا چرچا عدم تک پہونچ گیا ہے دکیونکہ دہنِ معشوق معدوم ہے اور جو بات معشوق کی دہن سے نکلے گی وہ گویا دنیائے عدم ہی کی بات ہوگی۔ غالب کا یہ شعر بھی ناگوار تکلّف و دُور دراز کار تخئیل کے سوا کچھ نہیں۔

غزل (۲۵)

۱۔ گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

دوسرے مصرعہ میں مُہرِ دہاں کو مقدم اور داغِ مہ کو مؤخر کر دیجئے تو مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر شبِ فرقت کی تکلیف میں نے بیان نہ کی تو بھی میری یہ خاموشی (مہرِ دہاں) داغِ ماہ کی طرح سب پر آشکار ہو جائے گی۔ مُہر اور داغ کی مشابہت ظاہر ہے۔

۲۔ زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

اگر شامِ ہجر کی تکلیف میں پتہ پانی ہو جاتا ہے تو عجب نہیں کہ پرتوِ مہتاب (چاندنی) بھی آب آب ہو جائے اور میرا گھر اس سیلاب میں ڈوب جائے۔

مدعا یہ کہ چاندنی رات میں ہجر و جدائی کا احساس بہت زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

۶۔ گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

مفہوم یہ ہے کہ اگر تیری نگاہِ گرم (نظرِ عتاب) اسی طرح مجھے ضبط پر مجبور کرتی رہی تو میرا خون میری رگوں میں بالکل اسی طرح نہاں (خشک) ہو جائے گا جیسے خس میں شعلہ پنہاں رہتا ہے (خس میں شعلہ کا پنہاں رہنا اس لئے تصور کیا گیا کہ خس میں جل جانے کی اہلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے)

غزل (۲۶)

۶۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جس طرح نمرود کی خدائی سے نمرود کو کوئی فائدہ نہ پہونچا اسی طرح میری بندگی سے بھی میرا بھلا نہ ہوا۔ گویا میری بندگی اور نمرود کی خدائی دونوں ایک سی چیز تھیں۔
اس شعر کا حسن یہ ہے کہ اس میں بندگی کا مرتبہ خدائی تک پہونچا دیا ہے۔

۸۔ زخم گر دب گیا لہو نہ تھما کام گر رک گیا روا نہ ہوا

پہلے مصرعہ کو اس طرح پڑھئے جیسے کسی واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعہ کو حیرت و استعجاب کے لہجہ میں۔ مفہوم یہ ہے کہ جب ہمارا کوئی کام رکا تو وہ رکا ہی رہا (روا نہ ہوا) برخلاف اس کے ہمارے زخم کا یہ حال ہے کہ دبنے کے بعد بھی اس سے لہو رستا رہا حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح لہو نہیں رکا کام بھی نہ رکنا چاہیئے تھا۔

مدعا یہ کہ میری بدنصیبی کبھی کسی بات میں کامیاب ہونے نہیں دیتی اور ہر بات کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

غزل (۲۷)

۱۔ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اس شعر میں شوق کی تعبیر اضطراب دریا سے کی گئی ہے اور دل کی گہر سے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرے شوقِ محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل ایسی چیز میں بھی (جو وسعتِ دو جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سما سکتا تھا، لیکن مجبوراً اُسے دل کے اندر ہی سمانا پڑا۔ گویا یوں سمجھیے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گہر کے اندر بند ہو گیا۔

۲۔ حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

اگر بہار ایسی ہی ناپائیدار آنے جانے والی چیز ہے تو اس کی حیثیت حنائے پائے خزاں سے زیادہ نہیں یعنی جس طرح مہندی کا رنگ چند دن کے بعد غائب ہو جاتا ہے اسی طرح بہار کی رنگینی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کا کوئی عیش پائیدار نہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ رنج و ملال ہی ہوا کرتا ہے۔

۷۔ نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

"جمع و خرچ دریا" سے مراد دریا کا مسلسل بہاؤ ہے۔

ناصح یا ہمدم سے خطاب ہے کہ میری گریہ وزاری جو تو دیکھ رہا ہے، میری حسرت کے لحاظ سے بہت کم ہے کیونکہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ آنسوؤں کے دریا جاری کر دے اور پھر بھی بس نہ کرے۔

غزل (۳۸)

۱۔ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس شعر میں غالب نے "نفس پروری" کا استعمال سانس روک کر دم بخود رہ جانے کے مفہوم میں کیا ہے جو غالب کی اختراع ہے۔

"خطِ جام" سے مراد وہ خط ہے جو ایک خاص اندازہ یا ناپ ظاہر کرنے کے لئے جام کے چاروں طرف کھینچ دیا جاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب محبوب نے جام شراب اپنے ہونٹوں سے لگایا تو شراب کے قطرے اس کے چہرے کا عکس پڑنے سے اس قدر حیرت زدہ ہوئے کہ خطِ جام پر وہ جم کر رہ گئے اور اس طرح خطِ جام گویا موتیوں کا ہار ہو کر رہ گیا۔

۲۔ اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میرے عشق پر محبوب کو اس قدر اعتماد و یقین ہے کہ جب غیر آہ کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ہی آہ کی ہوگی اور مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ پھر جب حالت یہ ہو تو میری تباہی و خانہ خرابی کی حد و پایاں کہاں ہو سکتی ہے۔ یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے۔

غزل (۲۹)

۲۔ اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

"حیرت کدہ" سے مراد یہاں آئینہ ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ جب وہ شوخی و ناز کے ساتھ آئینہ دیکھتا ہے تو جوہرِ آئینہ بھی طوطیِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔
فولاد کے آئینوں میں صیقل کرنے سے سبزی مائل نشانات پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں "جوہرِ آئینہ" کہتے ہیں۔ جوہر کی سبزی اور تڑپ کے لحاظ سے اس کو "طوطیِ بسمل" کہا گیا ہے۔

۳۔ یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

عربدہ :۔ جنگ
اس شعر میں دوسرے مصرعہ کو پہلے پڑھئے اور پہلے مصرعہ کو اس کے بعد کیونکہ پہلے مصرعہ میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے وہ نتیجہ ہے دوسرے مصرعہ کے مضمون کا۔
مفہوم یہ ہے کہ میری کم ہمتی نے دلِ امید دار کے اندر ایک ایسا طلسم پیدا کر دیا ہے جہاں یاس و امید میں ہر وقت جنگ ہوتی رہتی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔
طلسم کے ساتھ جنگ کا خیال اُن داستانوں سے لیا گیا ہے جن میں طلسم بند و طلسم کشا کے درمیان ہمیشہ جنگ دکھائی گئی ہے۔

غزل (۳۳)

۱۔ یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

جادہ:۔ راستہ، مگر یہاں باغ کی روش مراد ہے۔
فتیلہ:۔ چراغ کی بتی۔

مفہوم یہ ہے کہ باغ کا کوئی حصہ بیکار نہیں، یہاں تک کہ باغ کی روش بھی (جو پھولوں سے خالی ہوتی ہے) لالہ کے چراغوں کے لئے فتیلہ کا کام دیتی ہے۔ (لالہ کے درخت عموماً روش کے کنارے ہی نصب کئے جاتے ہیں۔

۲۔ بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

پہلے مصرع میں "آشوبِ آگہی" کی ترکیب غور طلب ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ اُسے مقلوب ترکیبِ اضافی مانا جائے (بمعنی آگہی آشوب) دوسری یہ کہ اُسے معمولی اضافی ترکیب جان کر خود آگہی کو آشوب قرار دیا جائے۔

ہر چند لفظ طاقت کے ساتھ پہلی ترکیب زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے لیکن غالب کے پیشِ نظر دوسری ترکیب تھی جس میں اُس نے خود آگہی کو آشوب یا ہنگامہ قرار دیا ہے۔

لفظ طاقت کے معنی صرف قوت کے ہیں اس لئے صحیح مفہوم تک پہونچنے کے لئے طاقت کے بعد کوئی لفظ بمعنی "برداشت" یا "تحمل" محذوف ماننا پڑے گا اور فارسی میں اس قسم کے محذوفات سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً طاقتِ مہماں نداشت، خانہ بہ مہماں گزاشت، کہ اس میں طاقت کے بعد لفظ میزبانی یا پذیرائی محذوف ہے۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہوش و آگہی کا ہنگامہ اتنا بڑا ہنگامہ ہے کہ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب پی پی کر اس ہوش و آگہی کو ختم کر دیا جائے۔

فارسی میں خط کشیدن "مٹا دینے" یا "محو کر دینے" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالبؔ نے خط کے ساتھ لفظ ایاغ (جام شراب) کا اضافہ کر کے ظاہر کر دیا کہ آشوب آگہی کو جامِ شراب ہی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

عجزِ حوصلہ سے خود اپنی بے حوصلگی مراد ہے جو ہنگامہ ہوش و آگہی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

۶۔ بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

میکدہ سے یہاں مراد آنکھ ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ آج کل میری آنکھوں سے خونِ دل نہیں بہتا تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ موجِ نگہ خشک ہو کر غبار ہو گئی ہے گویا میکدہ میں شراب نہ ہونے کی وجہ سے خاک سی اڑ رہی ہے۔

۷۔ باغِ شگفتہ تیرا، بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

پہلے مصرعہ کے محذوفات کو سامنے رکھنے کے بعد مفہوم یہ ہو گا کہ میرے نشاطِ دل کا سبب تیرے ہی حسن کا باغ شگفتہ ہو سکتا ہے۔ محض موسمِ بہار میں شراب نوشی سے مجھے سرور و انبساط حاصل نہیں ہو سکتا۔

غزل (۳۴)

۱۔ نہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خط کے عنوان سے بے ربطیٔ تحریر کا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح اسے میری چینِ پیشانی دیکھ کر میرے غمِ پنہاں کا حال معلوم ہو گیا۔
اس شعر میں چینِ جبیں کو بے ربطیٔ عنوان اور غمِ پنہاں کو راز مکتوب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

فولادی آئینہ میں جب صیقل کی جاتی ہے تو اس میں الف کی طرح لکیریں نمایاں ہو جاتی ہیں۔
مفہوم یہ ہے کہ جب سے میں نے گریباں کو گریباں سمجھا اُس وقت سے اسے چاک کرنا شروع کر دیا تھا لیکن میری دیوانگی اب تک صیقل کی لکیر سے آگے نہیں بڑھی (چاک کی صورت بھی الف کی طرح کھنچی ہوئی ہوتی ہے اور صیقل کی لکیر بھی ایسی ہی ہوتی ہے)

۵۔ عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

نبضِ خس سے مراد خس ہے جس طرح خَس (تنکے) کو دیکھ کر اُس کے جل جانے کی اہلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اسی طرح میں اپنی بیچارگی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محبوب یقیناً بدخو اور تند مزاج ہوگا، یعنی جس طرح خس کی قسمت میں آگ سے جل جانا لکھا ہے اسی

طرح محبوب کی برہمی سے میرا تباہ و برباد ہو جانا بھی مقسوم ہو چکا ہے۔

غزل (۳۵)

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

جگر تشنہ (سخت تشنہ)

شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے پڑھا جائے اور پہلا مصرعہ اُس کے بعد، تو مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ جب دل فریاد کے لئے بیتاب ہوا تو مجھے اپنا دیدۂ تر بھی یاد آیا یعنی وہ وقت یاد آگیا جب میں فریاد کے ساتھ بھی رو تا رہتا تھا لیکن اگر دونوں مصرعوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر غور کیا جائے تو دوسرا مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے مجھے پھر اپنا زمانِ اشکباری یاد آگیا اور پھر میں لذت اشکباری حاصل کرنے کے لئے فریاد پر بیتاب ہو گیا۔ دونوں صورتوں میں مفہوم قریب قریب ایک ہی سا رہتا ہے۔

۲۔ سادگی ہائے تمنّا یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

نیرنگ نظر میں اضافت نہیں۔ بلکہ پورا فقرہ صفت ہے محبوب کی۔

مفہوم یہ ہے کہ میری تمناؤں کی سادگی کو دیکھئے کہ باوجود اس علم و تجربہ کے محبوب پُرفن فریب میں مبتلا رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا، میں پھر بھی اُس کی تمنا کرتا ہوں اور اس سے وفا یا لطفِ کرم کی توقع رکھتا ہوں

۹۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں گھر کی ویرانی سے گھبرا کر صحرا گیا۔ لیکن وہاں بھی وہی گھر کی سی ویرانی دیکھی اس شعر میں (بقولِ حالی) صرف یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دشت اور گھر کی ویرانی بالکل ایک سی ہے۔

لیکن اس شعر میں حسن اُس وقت پیدا ہوتا جب یہ ظاہر کیا جاتا کہ میرا گھر دشت سے زیادہ ویران ہے۔ اگر پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا ہو سکتا کہ "دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے۔" تو بے شک گھر کی ویرانی دشت سے بڑھ جاتی ہے لیکن لفظ تھی نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا۔

۱۰۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے ازلی وفطری عاشق و مجنوں ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جب لڑکپن میں بھی مجنوں کے سر پہ پتھر پھینکنے کا خیال مجھے پیدا ہوا تو میں رک گیا اور مجھے اپنا سر یاد آ گیا کہ ایک وقت مجھے بھی دیوانہ ہونا ہے اور میرے سر پہ بھی لڑکے پتھر پھینکیں گے۔

غزل (۳۶)

۱۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

شعر کا مطلب صاف ہے۔ لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ ہے زمانۂ حال کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں تھا۔ زمانۂ ماضی کو اگر پہلے مصرعہ میں ہے کو تھا سمجھا جائے تو یہ تناقض دور ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے اس شعر کا مفہوم یہ ہو کہ جس وقت میں مقید کیا گیا تھا اس وقت یہ خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ ممکن ہے زنجیر کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو لیکن اب قید ہو جانے کے بعد تیری زلف کی یاد کے علاوہ گرانباریٔ زنجیر کا خیال ختم ہو گیا۔

۷۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا وے طالبِ تاثیر بھی تھا

غیر کا نالہ کرنا اور پھر تاثیر کا متمنی ہونا ظاہر کرتا ہے کہ غیر کامیاب نہ تھا اور اس کی ناکامی کا خیال ہمارے لئے باعثِ تسکین تھا۔

غزل (۳۷)

۱۔ لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

پہلے مصرعہ میں لبِ خشک کے بعد یا پہلے "میں ہوں" محذوف ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ تشنگی (شوق) میں جان دے چکے ہیں میں اُن سب کا لبِ خشک ہوں یعنی اُن سب کی تشنگی مجھ میں سما گئی ہے اور اسی لئے تمام آزردہ دل لوگ میرا احترام کرتے ہیں۔

۲۔ ہمہ نااُمیدی، ہمہ بدگمانی
میں دِل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

جس طرح فریبِ وفا میں مبتلا رہنے والوں کا دل ہمیشہ نااُمیدی و بدگمانی کا شکار رہتا ہوں بالکل اسی طرح میں بھی فریبِ وفا میں مبتلا ہو کر یکسر نااُمیدی و بدگمانی کا شکار ہو گیا ہوں۔

غزل (۳۸)

۱۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا   اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

"اے ستمگر تو دنیا میں کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ تو نے غیروں پر وہ ظلم کئے جو کبھی مجھ پر نہ کئے تھے۔" اس شعر میں غالب نے ایک طرف یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ وہ کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ اغیار بھی اُس کے ظلم سے نہ بچ سکے اور اُن پر مجھ سے زیادہ ستم روا رکھا گیا اور دوسری طرف اپنے جذبۂ رشک کو ظاہر کیا ہے کہ غیروں پر ظلم بھی کیا تو ایسا جو انھیں کے لئے مخصوص تھا اور میں اس سے محروم رہا۔ یہ شعر بھی مومن کے رنگ کا ہے۔

۲۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

"مہ نخشب" سے مراد حکیم مقنع کا وہ مصنوعی چاند ہے جو اُس نے بعض کیمیائی اجزاء سے بنایا تھا اور کچھ دیر روشن رہتا تھا۔

غالب اسی تلمیح، تشبیہہ کو سامنے رکھ کر کہنا چاہتا ہے کہ جس طرح "ماہ نخشب" اصلی چاند کا مقابلہ نہ کر سکا اور حکیم مقنع نے اس کوشش کو ترک کر دیا۔ اسی طرح قدرت نے بھی چاہا تھا کہ وہ محبوب کی تابشِ حسن کے مقابلہ میں خورشید بنائے لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اس میں کامیابی ممکن نہیں تو پھر یہ خیال ترک کر دیا اور خورشید جیسا ناقص تھا ویسا ہی رہ گیا۔ مدعا یہ کہ میرے محبوب کی تابشِ جمال کا مقابلہ سورج نہیں کر سکتا۔

۳۔ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

قدرت کا دستور ہے کہ جو شخص جتنی ہمت کرتا ہے، اُتنی ہی توفیق اس کو عطا ہوتی ہے قطرۂ نیساں نے صرف موتی بننے کی تمنا کی اور وہ موتی بن گیا لیکن وہ قطرۂ آب جس نے اُس سے زیادہ ہمت کی وہ آنسو بنا۔ مدعا یہ کہ آنسو کی قیمت موتی سے زیادہ ہے۔

۵۔ میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

دوست کی آزردگی سے میں اس لئے خوش ہوں کہ اس طرح مجھے دوبارہ اظہارِ شوق اور مجبوب کو منانے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس خیال کو بہ لحاظ نتیجہ وہ محض سادہ دلی سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ اس طرح آزردگیٔ یار دُور نہ ہو سکے گی اور اگر ہوئی بھی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں تاہم وہ صرف اس لئے خوش ہے کہ اس بہانہ سے اظہارِ شوق و محبت یار کا موقع اسے پھر مل جائے گا۔

۷۔ جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

مشہور ہے کہ جب آتش کدہ میں صدیوں تک آگ مسلسل روشن رہتی ہے تو اس میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جسے سمندر کہتے ہیں۔
تحصیل سے مراد "تحصیل آتش نفسی" ہے۔ مدعا یہ کہ میرے داغِ جگر کی گرمی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آتش کدہ میں سمندر بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس طرح دنیا کا کوئی آتشکدہ میرے داغِ جگر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غزل (۳۹)

۱۔ شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

خلوتِ ناموس:۔ خلوتِ شرم و حیا
رشتۂ شمع:۔ شمع کے اندر کے دھاگے کو کہتے ہیں۔

کسوت :- لباس

مفہوم یہ ہے کہ رات کی خلوتِ شرم و حیا میں جب وہ جلوہ افروز ہوا تو ہر شمع خار در پیراہن (مضطرب) نظر آنے لگی کیونکہ اُس کی خلوتِ ناموس اس کی مقتضی نہ تھی کہ وہاں شمع کا وجود بھی پایا جاتا۔

کسوتِ فانوس کو پیراہن اور رشتۂ شمع کو خار قرار دینا فارسی محاورہ "خار در پیراہن" سے ماخوذ ہے۔

اس شعر میں محبوب کے تقدسِ شرم و حیا کا اظہار بیدل کے انداز میں کیا گیا ہے۔

۳- حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

مفہوم یہ ہے کہ الفت اگر کامیاب ہو تو بھی اس کا انجام مایوسی اور شکستِ آرزو کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ اگر عاشق و محبوب دونوں کے دل ایک دوسرے سے پیوستہ و ملے ہوئے، نظر آئیں تو بھی اُن کی حالت ایسی رہے گی جیسے افسوس کی حالت میں لب مل جاتے ہیں۔

۴- کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

"کیموس" ہضم طعام کا دوسرا درجہ ہے جب غذا معدہ میں رقیق ہو کر خون کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پہلا درجہ ہضم کیلوس کہلاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ بیماریٔ غم کی فراغت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ میں کھاتا ہوں وہ کیموس کی منزل سے گزرے بغیر خون بن جاتا ہے۔ اور گویا صحیح معنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کھانا

نہیں کھاتا بلکہ خون کھاتا ہوں

غزل (۴۱)

۴۔ بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

شش جہت :- ہر طرف ہر جگہ۔
یاں سے مراد زمانہ یا نظام فطرت ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ قدرت ناقص و کامل کا امتیاز نہیں کرتی۔ اُس نے چاروں طرف در آئینہ باز کر دیئے ہیں اور ہر شخص اپنی تصویر (وہ جیسی بھی ہو) اس کے اندر دیکھ سکتا ہے۔

۵۔ وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

یعنی میرے جذبۂ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے اب اگر کوئی چیز حائل ہے تو صرف نگاہ۔
مُدعا یہ کہ حجاباتِ حسن دور ہونے کے بعد ہی حسن کا صحیح مطالعہ ہو سکتا ہے۔

غزل (۴۲)

۲۔ ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

میخانۂ نیرنگ :- طلسم زارِ عالم
چشمک ہائے لیلیٰ :- (لیلیٰ کے اشارہ ہائے چشم) اُردو میں چشمک کا استعمال رنجش کے

مفہوم میں بھی ہوتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مجنوں کی صحرانوردیاں صرف لیلیٰ کے اشارۂ چشم کی اشارہ تابع ہیں۔ اسی طرح دنیا کا ذرّہ ذرہ قدرت کے میخانۂ نیرنگ کا ساغر ہے اور اسی کے اشاروں پر گردش کرتا ہے۔ یعنی تمام مظاہر و آثار ایک خاص قانونِ قدرت کے پابند ہیں جس سے انحراف ممکن نہیں۔

۴۔ شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

ساماں طراز :۔ سامان مہیا کرنے والا۔

دستگاہ :۔ اہلیت و قابلیت۔

صحرا دستگاہ ، صفت ہے ذرہ کی اور "دریا آشنا" صفت ہے قطرہ کی۔ یعنی وہ ذرہ جس میں صحرا کی سی وسعت ہے اور وہ قطرہ جو دریا کی طرح وسیع ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم اربابِ عجز کے فخر و ناز کے لئے ہمارا شوقِ محبت کافی ہے جو ہماری ذرہ آسا اور قطرہ تمثال ہستی میں صحرا کی سی وسعت اور دریا کی سی پہنائی پیدا کر دیتا ہے۔

۵۔ کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرہاد محض ایک نقاش تھا جو پتھر کاٹ کر شیریں کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ اگر صحیح معنی میں وہ شیریں کا عاشق ہوتا تو یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ پتھر پر سر مارتا اور شیریں سامنے نہ آجاتی مراد یہ کہ فرہاد کا عشق، عشقِ صادق نہ تھا۔

غزل (۴۵)

۵۔ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

غافل انسان اس وہم میں مبتلا ہے کہ اس کی فلاح و صلاح خود اس کی کوشش و تدبیر کا نتیجہ ہے، حالانکہ دراصل سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے حتیٰ کہ گھاس ایسی حقیر چیز کی زیبائش میں بھی صبا کا ہاتھ شامل ہے۔

۶۔ بزمِ قدح سے عیش، تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

عیش کو تمنا سے الگ بغیر اضافت کے پڑھنا چاہیئے (یعنی عیش تمنا نہیں)
مفہوم یہ ہے کہ مے نوشی سے یہ تمنا رکھنا کہ وہ باعثِ مسرت و انبساط ہوگی یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ ایک ایسا صید ہے جو اس دامگاہ سے نکل کر بھاگ چکا ہے یعنی مسرت کے خیال سے مے نوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؏
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

غزل (۴۶) صاف ہے۔

غزل (۴۷)

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پہلا مصرع میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ لطافت بغیر کثافت کے یا روحانیت بغیر مادّی

ذرائع کے پیدا نہیں ہو سکتی اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ بادِ بہاری جو بجائے خود بڑی لطیف چیز ہے اُس کا علم ہمیں چمن ہی کی وساطت سے ہوتا ہے حالانکہ چمن کی حیثیت آئینہ بہار کے زنگار کی سی ہے جو کثیف چیز ہے۔

آئینہ کے پیچھے جب تک زنگار نہ پیدا کیا جائے وہ عکس پذیر نہیں ہوتا۔

۲۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

مفہوم یہ ہے کہ ساحل لاکھ خوددار ہو لیکن جب دریا جوش پر آتا ہے تو وہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اسی طرح جس محفل کا ساقی تو ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

غزل (۴۸)

۹۔ تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

ہوائے صیقل: صیقل کی خواہش۔

برسات میں آئینۂ فولاد پر زنگ آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زنگار ہی صیقل آئینہ کا باعث ہوتا ہے۔ مدعا یہ کہ جب شوق کامل ہوتا ہے تو اس کے پورے ہو جانے کے اسباب خود پیدا ہو جاتے ہیں۔

غزل (۵۰)

۱۔ افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

یعنی وہ انگلیاں جو کسی وقت موتی کی لڑی سے کھیلتی تھیں آج وہی انتہائی حسرت دیکھا

کے عالم میں دانتوں سے کاٹی جا رہی ہیں

غزل (۵۳)

۱۔ آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دُودِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست

جس طرح شمع گل ہونے پر پروانے نظر نہیں آتے اُسی طرح سبزۂ خط نمودار ہونے سے بازارِ دوست سرد ہو گیا یعنی اُس کے عشاق کم ہو گئے۔ گویا سبزۂ خط بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔

۲۔ خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشہ کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

خانہ ویراں سازی:۔ گھر اُجاڑنا
تماشہ کیجیے:۔ دیکھیے۔ فارسی میں تماشہ کردن دیکھنے کے معنی میں مستعمل ہے۔

رفتہ:۔ وارفتہ
محبوب ایک راستہ سے گزرتا ہے اور عاشق اُس کی رفتار کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں بھی گویا نقشِ قدم ہوں اور اسی کی طرح مجھے بھی خانہ برباد ہو جانا ہے۔
نقشِ قدم میں صورت صرف بربادی ہی کی نہیں بلکہ حیرت کی بھی پائی جاتی ہے اور اسی لئے غالبؔ کا خیال "خانہ ویراں سازیٔ حیرت" کی طرف منتقل ہوا۔

۴۔ عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

میں بیمار دوست ہوں اور اسی بیماری میں مجھے جان دینا چاہیے تھی لیکن ہوا یہ کہ دشمن پر اُس کا التفات یا ظلم زیادہ ہو گیا اور میں اس رشک سے جاں بر نہ ہو سکا۔ گویا کشتۂ دوست ہونے کی جگہ مجھے کشتۂ دشمن ہونا پڑا۔

۵۔ چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے

دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

اگر ہمارا دیدۂ پُرخوں بیدرد دوست کی نگاہ میں ایک ساغرِ لبریز کی کیفیت رکھتا ہو تو ہم بھی اس سے خوش ہیں اور ہم کو اس کی کوئی شکایت نہیں۔

اگر دوسرے مصرع کو پہلے پڑھا جائے اور فخر و تعجب کے لہجہ میں تو مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔

غزل (۵۴)

۲۔ کمال گرمیٔ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ

برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

دیدِ یار کے لئے جو انتہائی کوششیں میں نے کی ہیں اُن کا حال مجھ سے نہ پوچھو بلکہ میرے آئینہ حیرت کو دیکھ کر معلوم کر جس میں جوہر کی جگہ تم کو خار ہی خار نظر آئیں گے۔

۵۔ بہ نیم غمزہ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز

نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

ودیعت:۔ امانت

محبوب کا خنجرِ ناز ایک ودیعت یا امانت تھا جسے غالب نے اپنے نیامِ زخمِ جگر میں چھپا

رکھا تھا لیکن اب وہ اپنی اس خدمتِ امانت داری کا معاوضہ اس صورت سے چاہتا ہے کہ محبوب "نیم غمزہ" سے کام لے کر اس خنجر کو جگر سے باہر کھینچ لے۔

سوال یہ ہے کہ غالب نے "نیم غمزہ" کیوں کہا اور جگر سے خنجر باہر کھینچ لینا کیوں کر امانتداری کا معاوضہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ غالب نے خنجر ناز کہا ہے اور اسی کے ساتھ "نیم غمزہ" کے ساتھ اس خنجر کے کھینچ لینے کی درخواست کی ہے اس لئے یہ تمام اشارات دُور کرنے کے بعد مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایک بار تو نے اپنے عشوہ و ناز سے کام لے کر میرے جگر میں خنجر سا پیوست کر دیا تھا اب پھر نیم غمزہ سے کام لے کر اسے باہر نکال لے اور دوبارہ پھر میرے جگر کو مجروح کر دے (نیام سے خنجر نکال لینے کے معنی یہی ہیں کہ اسے استعمال کیا جائے)

"نیم غمزہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دل کو مجروح کرنے کے لئے "نیم غمزہ" زیادہ مؤثر ہوا کرتا ہے۔

سادہ الفاظ میں مفہوم یہ ہوا کہ میں تیرے ناز و عشوہ کا عرصہ سے مجروح ہوں جسے میں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، لیکن اب میں اپنی اس رازداری کا معاوضہ چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تو اپنے "نیم غمزہ" سے مجھے اور زیادہ زخمی کر دے۔

۶۔ مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

قدح سے مراد قدحِ دل ہے اور آتشِ پنہاں سے آتشِ محبت

سفرہ:۔ دسترخوان۔

سمندر:۔ آگ کا کیڑا

میرے ساغرِ دل میں آتشِ محبت کی شراب بھری ہوئی ہے اور وہی میں پیا رہتا ہوں

اس لئے گزک کے لئے مجھے دلِ سمندر کا کباب چاہیئے۔

غزل (۵۷)

اس غزل میں غالب نے اپنے اٹھ جانے پر آپ اپنا ماتم کیا ہے اور نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں کہا ہے کہ میرے نہ ہونے سے دنیائے حسن و عشق کس کس طرح ویران ہوئی اور کتنے کاروبارِ عشق معطل ہو گئے۔ معشوقوں نے غمزہ و ناز سے ہاتھ اٹھا لیا۔ سرمہ تک لگانا چھوڑ دیا۔ اہلِ جنوں سے جنون رخصت ہو گیا۔ عشق پر سوگواری طاری ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

یعنی جس طرح شمع بجھنے کے بعد اُس سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے جو علامت ہے سوگواری کی اسی طرح میرے بعد شعلۂ عشق سیہ پوش (ماتمدار) ہو گیا کیونکہ اب مجھ سا دوسرا کہاں پیدا ہوگا جو شعلۂ عشق کی گرمی کو باقی رکھ سکے۔

۵۔ درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمہ سے خفا میرے بعد

جوہر:۔ اصل مادہ

عرض:۔ وہ چیز جس کے ذریعہ سے جوہر ظاہر ہوتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے جوہرِ بیداد ظاہر ہونے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی عرض کی ضرورت تھی اور وہ عرض یا مظہر میری ذات تھی اس لئے اب کہ میں نہیں ہوں اس کی نگہِ ناز کس کے لئے سرمہ آلود ہو۔

مدعا یہ کہ اُس کی "چشمِ سرمگیں" کا صحیح ہدف صرف میں ہو سکتا تھا اس لئے اب کہ میں نہیں ہوں وہ کیوں سُرمہ استعمال کرے۔

۶۔ ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے ذوقِ جنوں کی ماتمداری کی ہے اور کہتا ہے کہ میرے نہ ہونے سے اب تمام اسبابِ جنوں درہم برہم ہو گئے ہیں۔ چاک گریبان سے جدا ہو رہا ہے اور گریبان چاک سے گویا یوں سمجھو کہ جنوں اہلِ جنوں سے رُخصت ہو رہا ہے۔ اور وہ رسمِ دیوانگی جو میں نے قائم کی تھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی ہے۔

غزل (۶۰)

۱۔ کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

جلوۂ محبوب کو دیکھ کر مجھے جل کر خاک ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میری طاقتِ دید نے ایسا نہ ہونے دیا اور اب میں اس سے جلنے لگا ہوں کہ اُس نے کیوں مجھے اس سعادت و شرف سے محروم رکھا۔

۲۔ کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو "بے سبب آزار" دیکھ کر

بے سبب آزار:- بغیر کسی سبب کے آزار پہنچانے والا۔

مفہوم یہ ہے کہ آبروئے عشق وہیں قائم رہ سکتی ہے جہاں جفا عام نہ ہو بلکہ اسکا خاص مقصد ہو اور صرف مستحقین کے لئے مخصوص ہو، لیکن تم اُس کے پابند نہیں اور نا اہلوں پر بھی جفا کرتے ہو اس لئے میں تمھاری یہ ادا دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوں اور تمھاری طرف سے رُکا رُکا سا رہتا ہوں۔

غزل (۶۱)

۲۔ نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفیدی سے مراد یہاں آنکھ کا نور ہے اور وہ سفیدی یا قلعی بھی جو صفائی کے لئے دیواروں پر پھیری جاتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ حُسن جہاں بھی ہو اپنی خانہ آرائی سے نہیں باز آتا۔ حد یہ ہے کہ یوسف جب زنداں میں پہونچے تو وہاں بھی آرائش و صفائی کے سلسلہ میں دیدۂ یعقوب سے کام لیا گیا۔ چونکہ یعقوب کی نگاہیں ہر وقت یوسفؔ کو تلاش کرتی رہتی تھیں اور یوسفؔ بھی اپنے باپ کو بہت یاد کرتے رہتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ انھیں زنداں میں بھی اپنے باپ کی منتظر آنکھوں کا خیال آیا ہوگا اور انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ شاید یعقوب کی آنکھیں مجھے زنداں میں بھی دیکھ رہی ہیں اور اسی کیفیت کو غالبؔ نے زنداں پر دیدۂ یعقوب کی سفیدی پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔

۳۔ فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اس زمانہ سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

مفہوم یہ ہے کہ میں اس زمانہ سے درسِ بیخودی پڑھ رہا ہوں جب مجنوں دیوارِ دبستاں پر

لام الف (یعنی لا) لکھا کرتا اور درسِ فنا کی ابتدائی مشق کیا کرتا تھا۔

مدعا یہ کہ بیخودی کے باب میں مجنوں بہت مشہور ہے لیکن میرے سامنے وہ طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پُشتِ چشم سے جس کے نہ ہوئے مُہر عنواں پر

طومار:۔ دفتر۔
پُشتِ چشم:۔ فارسی کا محاورہ ہے۔ "پشت چشم نازک کردن" جس کے معنی ہیں غمزہ اور ناز وادا سے کام لینا۔ غالب نے یہاں ناقص محاورہ استعمال کرکے صرف "چشم پشت" لکھ کر یہ مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیائے محبت میں کوئی دفترِ ناز ایسا نہیں ہے جس پر اس کی یعنی محبوب کی "چشم پشت" نے مہر توثیق ثبت نہ کر دی ہو۔ (چشم پشت کی مشابہت مہر سے ظاہر ہے) یعنی صحیح معنی میں اگر ناز کا وجود کہیں پایا جاتا ہے تو وہ صرف چشمِ یار میں۔

۵۔ بجز پرواز شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

چونکہ جاں دادگانِ محبت کا وجود پروازِ شوق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے اگر قیامت آئی بھی تو کیا؟ اس کی حیثیت صرف ایک ہوائے تند کی سی ہو گی جو شہیدانِ محبت کی خاک اُڑا لے جائے۔

غزل (۶۴)

۱۔ جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

گریباں چاک :۔ چاکِ گریباں۔ گریباں چاکی

مفہوم یہ ہے کہ جنوں کی دستگیری یا اُس کا اظہار صرف عریانی سے ہو سکتا ہے اور چونکہ میری گریباں چاکی ہی نے مجھے عریاں کر کے میرے جنوں کی دستگیری کی ہے اس لئے میں اس کا شکر گزار ہوں۔

۲۔ برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

نیرنگ بیتابی :۔ فاعل ہے۔ "باندھے ہے" کا

مفہوم یہ ہے کہ جلے ہوئے کاغذ کی طرح، میرا نیرنگِ بیتابی بھی بالِ یک تپیدن پر ہزاروں آئینہ ہائے دل رکھتا ہے۔

یعنی جس طرح جلے ہوئے کاغذ کے حروف و نقاط چمکنے لگتے ہیں، اسی طرح میرے بالِ تپش پر ہزاروں آئینہ ہائے دل نمودار ہو گئے ہیں۔

اس شعر میں غالبؔ نے خود تپیدن یا تپش کو بال دپر قرار دیا ہے۔

۳۔ ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

بے سبب رنج :۔ بغیر کسی سبب کے رنجیدہ ہو جانے والا

آشنا دشمن :- دوستوں کا دشمن

مفہوم یہ ہے کہ ایسے زود رنج اور بدگمان محبوب سے ہمارا واسطہ پڑا ہے کہ روزنِ دیوار سے سورج کی کرن آتی ہے تو اُسے بھی وہ ہمارا اندازِ نگاہ سمجھ کر برہم ہو جاتا ہے۔

۵۔ فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

مفہوم یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقت سمجھنے کا شائق ہے تو خاشاک کی طرح آگ میں جل جا یعنی جس طرح خاشاک کی انتہائی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جل کر خاک ہو جائے اسی طرح انسان اگر اپنی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ جلوۂ محبوب یا جلوۂ خداوندی پر اپنے آپ کو فنا کر دے۔

غزل (۶۷)

۲۔ ہے نازِ مفلساں، زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

جس طرح ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت پہ مفلس فخر کرتا ہے اسی طرح مجھے بھی اپنے داغ ہائے دل کی گل فروشی پر ناز ہے۔

۳۔ مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے، بُتِ بیدادِ فن ہنوز

"خمیازہ" انگڑائی کو کہتے ہیں، نشہ جب اُترتا ہے تو انسان جمھائی اور انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ یہاں تو یہ حال ہے کہ میخانۂ

جگر میں شراب یعنی خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا اور وہاں بت بیداد فن انگڑائیاں لے رہا ہے اور مزید شراب طلب کرتا ہے۔

مدعا یہ کہ خونِ جگر سب کا سب ختم ہو چکا اور اب ایک قطرۂ خوں بھی باقی نہیں کہ نذرِ محبوب کیا جائے۔

غزل (۶۸)

۱۔ حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز

دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

"حریفِ مطلبِ مشکل نہ ہونا" کسی مطلب مشکل کو پورا نہ کر سکنا۔

مفہوم یہ ہے کہ اپنی نیاز مندیوں سے کوئی دشوار کام تو نکلتا نہیں اس لئے اب آؤ یہی دعا کریں کہ "عمر خضر" دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں جو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ اس شعر میں غالب نے بڑے لطیف طنز سے کام لیا ہے۔

۲۔ نہ ہو بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہم وجود

ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

بہ ہرزہ:۔ بے کار

مفہوم یہ ہے کہ مسئلۂ وجود میں خوامخواہ فکر و قیاس سے کام لینا بیکار ہے کیونکہ اس باب میں تیرا ہر تصور نشیب و فراز اور ناہمواری سے خالی نہیں اور تو اُس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ وصال، جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرداز

جلوہ تماشا:۔ جلوہ حسن کا تماشہ دکھانے والا۔

پرداز:۔ صیقل

مطلب یہ ہے کہ جلوۂ حسن کا تماشا وصل ہی پر موقوف ہے لیکن یہ طاقت کہاں کہ اس کے آئینہ، انتظار کی صیقل کیا کروں۔ یعنی وصال اپنی جگہ بہت پُرلطف چیز ہے لیکن تابِ انتظار کسے۔

غزل (۶۹)

۱۔ وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

سرتاسر خاک:۔ تمام روئے زمین

ابر کو قطراتِ باراں کی وجہ سے آبلہ پا کہا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ بخشش و کرم کی وسعت دیکھنا ہو تو ابر کو دیکھو کہ ابر باوجود آبلہ پا ہونے کے اپنی گہر باری ترک نہیں کرتا۔

۲۔ یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

یک قلم:۔ یکسر

مفہوم یہ ہے کہ میرے نقشِ قدم میں گرمیٔ رفتار کی تپش اب بھی اتنی باقی ہے کہ اس نے صحرا کو کاغذ کی طرح جلا کر رکھ دیا۔

غزل (۷۱)

۱۔ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گلِ نغمہ سے مراد نغمۂ طرب۔

پردۂ ساز:۔ ساز کے پردے جن سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی   ہم ہیں اور رازہائے سینہ گداز

لاف:۔ شیخی

تمکیں:۔ صبر و ضبط

اگر ہم اپنے صبر و ضبط پر فخر کریں تو یہ ہماری سادہ دلی یا ناآگہی کا فریب ہوگا، کیونکہ ہمارے سینہ میں تو ایسے راز چھپے ہوئے ہیں جو خود سینہ توڑ کر باہر آجانے والے ہیں اس لئے اگر ہم صبر و ضبط کا دعویٰ کریں تو یہ ہماری نادانی ہوگی۔

۵۔ اے ترا غمزہ یک قلم انگیز   اے ترا ظلم سر بسر انداز

انگیز:۔ نہایت دلکش ادائے ناز۔

مفہوم یہ ہے کہ تیرا غمزہ و ناز اور تیرا ظلم سب ایک ہی چیز ہیں اس لئے ان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

غزل (۷۳)

۱۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

اس شعر کی بنیاد صرف لفظِ سبزہ پر قائم ہے ۔ جس میں تراوت یا تر و تازگی پائی جاتی ہے ۔

سبزۂ خط سے مراد معشوق کا سبزۂ خط

جوہر کو خط اس لئے کہا کہ اس میں خس سے مشابہت پائی جاتی ہے ۔

مفہوم یہ ہے کہ روئے نگار کی تابش اور گرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر آئینہ دیکھتے وقت اس کا سبزۂ خط جوہرِ آئینہ کو طراوت نہ پہونچائے تو وہ جل کر رہ جائے ۔

۲۔ فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خارِ آتش

دوسرے مصرعہ میں خار سے مراد وہ دھاگہ یا بتی ہے جس کے جلنے سے شمع روشن ہوتی ہے ۔

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح پائے شمع ۔ یعنی خود شمع کا خار آگ ہی سے نکلتا ہے، اسی طرح عاشق کی مشکل بھی فروغِ حسن سے حل ہو سکتی ہے ۔

غزل (۷۵)

۱۔ رُخِ نگار سے ہے ۔ سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

"آتشِ گل" سے مراد محبوب کے رخسار کی سُرخی ہے ۔

مفہوم یہ ہے کہ معشوق کے چہرہ کو دیکھ کر شمع ازراہِ رشک سوزِ دائمی میں مبتلا ہے ۔ گویا شمع کی زندگانی کا سبب محض آتشِ گل ہے ۔ یعنی اگر رُخِ نگار کی سُرخی نہ دیکھتی تو شمع دائمی سوز میں مبتلا نہ ہوتی اور اس کی زندگی نام اس کے سوز ہی کا ہے ۔

۳۔ کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ، قصہ تمام
بطرز اہلِ فنا ہے، فسانہ خوانیِ شمع

جس طرح اہلِ فنا (اہلِ عشق) خود اپنی آتشِ محبت میں جل کر ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح شمع کی زندگی بھی خود اسی کے شعلہ کے نذر ہو جاتی ہے۔

۴۔ غم اُس کو حسرتِ پرواز کا ہے، اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

شمع کی لو ہر وقت لرزتی کانپتی رہتی ہے۔ غالبؔ اس کی تاویل یہ کرتا ہے کہ اس کی لو کی لرزش گویا ناتوانیِ شمع کو ظاہر کرتی ہے اور اس ناتوانی کا سبب یہ غم ہے کہ اسکی حسرتِ پرواز کماحقہ پوری نہ ہوسکی۔

۵۔ ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

دوسرے مصرعہ میں بہ۔ بائے تشبیہ ہے۔
جلوہ ریزی باد :۔ ہوا کا چلنا۔
اہتزاز :۔ جھومنا
پرفشانی شمع :۔ شمع کی لو کی تھرتھراہٹ

مفہوم یہ ہے کہ جب میں تیرا تصور کرتا ہوں تو میری روح میں بھی وہی لرزشِ مسرت پیدا ہوتی ہے جو شمع کی لو میں ہوا کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے، شہیدِ گلِ خزانی شمع

داغِ غمِ عشق سے جو مسرت مجھے حاصل ہے اُس کا حال نہ پوچھو۔ بس یوں سمجھ لو کہ شمع کے گلِ خزاں دیدہ پر بہار قربان ہو رہی ہے۔ داغِ غمِ عشق کی تعبیر "گلِ خزانی شمع" سے کی گئی ہے اور شمع کی "گلِ خزاں دیدہ سے"۔

غزل (۸۰)

۱۔ ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل اس خیال پر مٹی ہوئی ہے کہ پھول اس سے وفا کریں گے اور پھول اُس کی اس سادہ دلی پر ہنس رہے ہیں۔

۲۔ آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

غالبؔ کا یہ شعر یوں تو بہت صاف معلوم ہوتا ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے کافی مبہم ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ "آزادیٔ نسیم" کی مبارک باد کس کو دی جا رہی ہے، خود نسیم کو یا کسی اور کو۔ شعر کے الفاظ سے نسیم کے سوا کسی اور کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نسیم ہی کو اُس کی آزادی کی مبارک باد دی جاتی ہے لیکن اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی آزادی میں کون سی چیز حائل تھی۔
دوسرے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "حلقۂ دامِ ہوائے گل" میں پھنسی ہوئی تھی

اور اب ان حلقوں کے ٹوٹ جانے سے آزاد ہو گئی ہے لیکن ہوائے گل اور اس کا "حلقۂ دام" سے کیا مراد ہے؟ ہوا علاوہ خواہش و آرزو کے فضا کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور غالباً غالب نے اسی معنی میں اس کا استعمال کیا ہے۔

اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ فضائے گل یا فضائے بہار گویا نسیم کے لئے حلقۂ دام تھی کہ وہ اس سے چھوٹ کر کہیں اور نہ جا سکتی تھی لیکن اب کہ بہار ختم ہو گئی ہے اور اسکے حلقہ ہائے دام ٹوٹ گئے ہیں۔ نسیم آزاد ہے، جہاں چاہے جائے اور اسی آزادی پر اس کو مبارک باد دی گئی ہے۔ مدعا یہ کہ جب بہار کا وجود ہی ہمارے سامنے ختم ہو گیا تو ہم بوئے گل کے لئے آرزوئے نسیم کیوں کریں۔

۴۔ جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکہ میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

"موجِ رنگ کے دھوکہ میں مر گیا" یعنی موجِ رنگ پر فریفتہ ہو گیا۔ گل کو "لبِ خونیں نوا" فرض کر کے افسوس ظاہر کیا ہے کہ دنیا بھی کتنی حقیقت ناشناس ہے کہ وہ پھول کو موجِ رنگ سمجھ کر خوش ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ در اصل "لبِ خونیں نوا" ہے جس پر اظہارِ غم کرنا چاہیئے۔

۵۔ ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

نفسِ عطر سائے گل:۔ پھول کی عطریت و خوشبو۔
مفہوم یہ ہے کہ میرا رقیب تو تجھ تک پہونچ سکتا ہے اور میں نہیں پہونچ سکتا۔

۶۔ شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

یعنی میری مینا جو شراب سے خالی ہے اور میرا دل جو خواہشِ گل سے آزاد ہے یہ دونوں مجھے بادِ بہار سے شرمندہ رکھتے ہیں کیونکہ جب شراب اور ہوائے سیرِ گل دونوں میسّر نہیں تو پھر موسمِ بہار کا کیا لطف!

۷۔ سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

مدعا یہ کہنا ہے کہ چونکہ تیرا حسنِ غیور یہ نہیں چاہتا کہ میں کسی اور پر نگاہ ڈالوں، اس لئے میں رنگِ گل کو بھی خون ہی سمجھتا ہوں اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

غزل (۸۱)

۱۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بیش از یک نفس:۔ ایک لمحہ سے زیادہ

وہ لوگ جو آزادہ رو ہیں اگر کسی بات کا غم کرتے بھی ہیں تو اس کی مدت دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ اپنے ماتم خانہ کی شمع ہم برق سے روشن کرتے ہیں (جس کا دم بھر سے زیادہ قیام نہیں) تو ہمارا یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔

۲۔ محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

جس طرح گنجفہ کھیلنے والا پتوں کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے اسی طرح ہم اپنے تصور و خیال میں پچھلی صحبتوں کے اوراق (جو اپنے تنوع کے لحاظ سے نیرنگِ بُت خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں) الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔

۳۔ باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں

ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہاں ہنگامہ :- بہت زیادہ ہنگامہ

مطلب یہ ہوا کہ ہر چند ہماری ہستی ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے لیکن وہ ایسی ہی ناپائیدار ہے جیسے پروانہ کا جل کر ایک لمحہ کے لئے اپنے شبستانِ دل کو روشن کر لینا۔

۴۔ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو

ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ہماری ترکِ جستجو کا سبب قناعت نہیں بلکہ ہماری ضعف و کمزوری ہے جس پر ہماری ہمتِ مردانہ کو کوئی بھروسہ نہیں۔ مدعا یہ کہ وہ لوگ جو ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جاتے ہیں دراصل بڑے کم ہمت لوگ ہیں اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے "قناعت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل (۸۷)

۴۔ کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے

پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

میرا زندانِ غم اتنا تاریک ہے کہ اگر اُس کے روزن میں روئی رکھ دی جائے تو وہ بھی نورِ صبح معلوم ہوگی۔ قاعدہ ہے کہ تاریکی جب بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں تھوڑی سی سفیدی

بھی بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

غزل (۹۲)

۲۔ شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

میرا شوقِ جنوں مجھے ایسے صحرا میں لے گیا ہے جہاں جادہ (راستہ) ایسا ہی معدوم ہے جیسے دیدۂ تصویر میں نگاہ معدوم ہوتی ہے۔

۳۔ حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

آزارِ محبت میں جو لطف و مزہ ہے اس کو دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ یہ لذتِ آزار دیر تک قائم رہے لیکن مشکل یہ ہے کہ راہِ وفا تلوار کی دھار پر قائم ہے۔ یعنی راہِ وفا میں اول ہی قدم پر جان دینا پڑتی ہے۔ اور اس طرح دیر تک لذتِ آزار حاصل کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

۴۔ رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

اگر نالہ تاثیر کا منت کش نہیں تو میں خوش ہوں کیونکہ اس طرح ایک دائمی ناامیدی کے رنج میں مبتلا ہو جاؤں گا اور اسے گوارا کرنا پڑے گا۔

غزل (۹۵)

۱۔ عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

عشق کی تاثیر سے میں نااُمید نہیں ہوں کیونکہ کسی پر جان دینا کوئی بید کا درخت تو نہیں ہے جو پھل نہیں لاتا۔

غزل (۹۶)

۵۔ سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

شب رَو:۔ چور یا قزاق جو عموماً رات ہی کے وقت نکلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح شب رو کے نقشِ قدم سے اس کا سُراغ لگایا جاتا ہے اسی طرح میرے نالے کی گرمی کا پتہ میرے داغِ دل سے چل سکتا ہے یعنی اگر میرے نالہ میں اتنی گرمی ہے تو حیرت کی کیا بات ہے داغِ دل بھی تو اتنا ہی گرم ہے۔

غزل (۹۷)

۶۔ جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہو دوست سے دشمن کے باب میں

میری یہ بدگمانی کہ دوست غیر کے ادعائے وفا پر فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ درست نہیں کیونکہ جب محبوب سرے سے اس کا قائل ہی نہیں کہ دنیا میں وفا کا وجود کہیں پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دشمن کے اظہارِ محبت و وفا پر کیوں اعتماد کرنے لگا۔

غزل (۹۸)

۵۔ اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

حسبِ بیان مولانا حالی غیر سے "ماسوا اللہ" مراد ہے اور صوفیہ کے نزدیک واجب الوجود کے سوا جو کچھ ہے وہم ہی وہم ہے جو قابل توجہ نہیں۔
مدعا یہ کہ میں جتنا ماسوا اللہ کے وہم میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں اتنا ہی اپنی حقیقت یعنی خدا سے دور ہوتا جاتا ہوں۔

۶۔ اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں

شہود :۔ دیکھنا
شاہد :۔ دیکھنے والا
مشہود :۔ جسے دیکھا جائے۔
مشاہدہ :۔ ایک دوسرے کو دیکھنا۔

غالب نے اس میں اپنے عقیدۂ وحدت الوجود کا اظہار بالکل صوفیہ کی زبان میں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ جب شہود و شاہد و مشہود یعنی دیکھنا، دیکھنے والا اور دیکھا جانے والا سب ایک ہی چیز ہیں تو پھر لفظ مشاہدہ کا استعمال بے معنی ہے کیونکہ مشاہدہ نام ہے ایک دوسرے کو دیکھنے کا اور جب یہاں کوئی دوسرا ہی نہیں تو پھر مشاہدہ کیسا؟

۷۔ ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اس شعر میں بھی وحدت الوجود کا عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔
کہتا ہے کہ قطرہ، موج و حباب میں کیا رکھا ہوا ہے جس کو دیکھا جائے۔ اُن کی ہستی وہم کے سوا کچھ نہیں، یہ سب ظاہری صورتیں ہیں جن کے ذریعہ سے بحر اپنی نمائش کرتا رہتا ہے لیکن پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان اس مفہوم کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ ظاہر کیا ہو کہ وجودِ بحر تمام ہے صرف نمودِ صور کا اور یہ کہنا گویا بحر کے مقابلہ میں وجودِ صور یعنی قطرہ و حباب وغیرہ کو زیادہ اہمیت دینا ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

دوسرے مصرعہ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ معشوقوں کا حجاب میں رہنا اور سامنے نہ آنا بھی ایک قسم کی بے حجابی ہے۔ پہلے مصرعہ میں اس دعوے کا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ اپنے آپ سے بھی حجاب کیا جائے۔

۱۰۔ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

"غیب غیب سے مراد ذاتِ باری ہے جو عقل و ادراک کی حدود سے باہر ہے۔
شہود سے مراد عالمِ مظاہر و آثار ہے جسے ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔
مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم عالمِ شہود "مادیات" کہتے ہیں وہ بھی دراصل عالمِ احدیت ہو اور ہمارا ایسا سمجھنا کہ عالمِ شہود اُس سے علیحدہ کوئی چیز ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم خواب میں

یہ دیکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں حالانکہ ہم بدستور محوِ خواب ہیں۔

غزل (۱۰۰)

۴۔ شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاہد :۔ معشوق

ہستیٔ مطلق :۔ واجب الوجود

اس شعر میں غالبؔ نے دنیا کے موہوم ہونے کا ذکر عجیب انداز میں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ لوگوں کا دنیا کے بابت یہ کہنا کہ "وہ ہے" یعنی اُس کا علیحدہ وجود پایا جاتا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ اگر وہ ہے بھی تو بالکل اس طرح جیسے معشوق کی کمر یعنی نہ ہونے کے برابر (بالکل معدوم)۔

مدعا یہ کہ واجب الوجود سے علیحدہ کائنات کو ایک جداگانہ چیز سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

۵۔ حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

عشقِ پُر عربدہ :۔ عشقِ نبرد آزما، عشقِ جنگ جُو۔

گوں :۔ قابل۔ لائق۔

مفہوم یہ ہے کہ عشقِ جنگ جُو کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُس کا مقابلہ کیا جائے اور وہ ہمیں تباہ و برباد کر دے لیکن افسوس ہے میرا تنِ رنجور اس قابل نہیں کہ عشق کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اور وہ مجھے پوری طرح خراب و برباد کر دے۔

۴۔ صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

صاف دردی کش:۔ تلچھٹ سے صاف شراب کا پینے والا۔
جم:۔ جمشید جسے شراب کا موجد سمجھا جاتا ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ ہم بادہ خواری میں جمشید کے مقلد ہیں اور ایسی صاف شراب پینا پسند کرتے ہیں جو تلچھٹ سے خالی ہو اس لئے اگر ہم کو انگوری شراب (جو سب سے بہتر ہوتی ہے) میسر نہیں تو اس پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

غزل (۱۰۱)

۵۔ وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

بدا:۔ وائے کا ہم معنی ہے یعنی بڑا ہو۔
مفہوم یہ ہے کہ ہم تو فریاد اس لئے نہیں کرتے کہ وہ خوئے وفا و تسلیم کے خلاف ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ہم فریاد کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔
مدعا یہ کہ اگر وہ ہماری خاموشی کو صبر و ضبط کا نتیجہ سمجھتا تو ممکن ہے کسی وقت مائل بہ کرم ہوتا لیکن اب یہ صورت باقی نہیں۔

۶۔ رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

"چراغانِ سرِ رہگذرِ باد" سے مراد وہ چراغ ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ روشن کئے جائیں اور ہوا انھیں فوراً بجھا دے۔

مفہوم یہ ہے کہ گل و لالہ کا رنگ خودداری اسی لیے پریشان و ابتر ہے کہ اُس کی حیثیت اُس چراغ کی سی ہے جو ہوا کے رُخ پر روشن کیا جائے اور ہوا اُسے بجھا دے۔

مدعا یہ کہ دنیا میں مسرت بڑی ناپائیدار چیز ہے۔

۸۔ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ "ایجاد نہیں"

معشوق کے دہن کو معدوم کہتے ہیں اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ اُس کے دہن سے ہمیشہ "نہیں" "نہیں" نکلتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اُس کے دہن کا اثبات حرف نفی (نہیں نہیں) سے ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ ہر بات پر "نہیں" نہ کہتا تو ہمیں اس کے دہن کا بھی پتہ نہ چلتا۔

نہیں سے ہاں یا عدم سے وجود کا اثبات بڑے لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔

غزل (۱۰۴)

۲۔ دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

سرگرم:۔ فارسی میں سرخوش کا مترادف ہے لیکن کنایۃً کسی کام میں زیادہ منہمک ہو جانے والے کو بھی کہتے ہیں۔

اس شعر میں غالبؔ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ محبوب کی الفت آزمانے کی کوشش نہ کر، کیونکہ الفت آزمائی بڑی سخت چیز ہے اور محبوب کا نازک دل مشکل ہی سے اس کا متحمل ہو سکتا ہے اس لیے نتیجہ یہ ہو گا کہ خود تمھیں کو اس سے تکلیف ہو گی۔

غزل (۱۰۸)

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

جب پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں تو عموماً اُن پر مہندی باندھ دیتے ہیں تاکہ چھالے اچھے ہو جائیں لیکن غالب کہتے ہیں کہ یہ چارہ سازوں کی واماندگی اور سعی بیجا ہے، کیونکہ جب آبلہ پائی مجھے صحرانوردی سے باز نہ رکھ سکی تو اس کی حنابندی کیا باز رکھ سکتی ہے۔

لیکن اس صورت میں دوسرے مصرع میں بھی کا استعمال بے محل ہو جائے گا اس لئے بھی کے پیش نظر شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آبلوں پر حنا باندھنا اگر اس لئے ہے کہ میں چل نہ سکوں تو بیکار بات ہے کیونکہ خود آبلے ہی مجھ کو صحرانوردی سے باز نہ رکھ سکے تو کیا اُن پر مہندی لگانے سے میں صحرانوردی ترک کر دوں گا؟

غزل (۱۱۲)

۲۔ دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

مفہوم یہ ہے کہ جب ہم حسرتِ دیدار کے لئے اپنے دل کو تباہ و برباد کر چکے تو پتہ چلا کہ یہ بالکل بیکار سی بات تھی کیونکہ اگر ہم کو دیدار کا کوئی موقع ملتا بھی تو ہم اُس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتے تھے، جب کہ ہم میں خود دیدار کی طاقت ہی موجود نہ تھی۔

۳۔ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مفہوم یہ ہے کہ اگر تجھ تک رسائی آسان نہ ہوتی یعنی دشوار ہوتی تو یہ بات ہمارے لئے سہل تھی کیونکہ اس طرح ہم مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جاتے لیکن چونکہ تیرا ملنا ناممکن نہیں ہے بلکہ غیر سے مل سکتا ہے اس لئے نہ ہمارا شوق آرزو کم ہوتا ہے اور نہ یہ جذبۂ رقابت کہ تجھ سے ہر شخص مل سکتا ہے۔

۷۔ ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

خدا کو مان :۔ خدا سے ڈر۔

مفہوم یہ ہے کہ لوگ جب کسی طائر کو گرفتار کرتے ہیں تو اُس کی بیقراری و فریاد پر انھیں رحم آجاتا ہے لیکن تو میری فریاد و زاری پر مطلق رحم نہیں کرتا۔ تو کیا میرے نالہائے زار نوائے مرغِ گرفتار سے بھی کم ہیں جن کا اثر تجھ پر نہیں ہوتا۔

غزل (۱۳۱)

۱۔ نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے در خور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

بخیہ کے در خور :۔ بخیہ کے قابل

رشتہ :۔ دھاگہ

چشمِ سوزن :۔ سوئی کا ناکہ

چونکہ میرا جسم زخموں کی کثرت سے اتنا تار تار ہو گیا ہے کہ اُس میں ٹانکے لگانا ممکن

نہیں اور سوزن مایوس ہو چکی ہے اس لئے چشمِ سوزن کا ناگہ گویا اُس کا تارِ اشک ہے۔
جس سے وہ اپنی ناکامی و مایوسی کا اظہار کر رہی ہے۔

۲۔ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ، خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

مفہوم یہ ہے کہ سیلابِ اشک سے ہم نے اپنے گھر کو اس لیے ویران کر دیا تھا کہ ذوقِ تماشا کے لئے فضا زیادہ وسیع ہو جائے گی لیکن بد قسمتی دیکھیے کہ کفِ سیلاب روزنِ دیوار میں روئی کی ڈاٹ ہو کر رہ گیا ہے اور اب ہم روزنِ دیوار سے جھانک بھی نہیں سکتے۔

۳۔ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

میرے جسم کا ہر قطرۂ خوں گویا ایک نگینہ ہے جس پر کاوشِ مژگاں نے معشوق کا نام کندہ کر دیا ہے اور میں اُن کا امانت دار ہوں۔ اسی مفہوم کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۴۔ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

میرے شبستاں یا خواب گاہ کی تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اگر روزنِ دیوار میں روئی رکھ دیں تو وہ بھی چاند کی طرح روشنی دینے لگے۔ (انتہائی تاریکی میں ہر وہ شے جو سفیدی مائل

ہو کا نی نمایاں ہو جاتی ہے) شدت تاریکی کے اظہار میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

۵۔ نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش :۔ ملامت و تضحیک۔

چونکہ احباب نے میری دیوانگی کی ہنسی اُڑائی اور میں اُن کی ملامت و تضحیک کی وجہ سے جوشِ جنوں میں اپنے جیب و دامن کو چاک نہ کر سکا اس لئے یوں سمجھنا چاہیئے کہ خندۂ احباب نے گویا میرے جیب و دامن کے لئے بخیہ کا کام دیا۔ (خندہ اور بخیہ کی مشابہت ظاہر ہے)۔

غزل (۱۱۸)

۴۔ بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا مگر اثرِ نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

"نفسِ بے اثر" کہنے کے بعد یہ کہنا کہ اس میں اثر نہیں عجیب بات ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اگر میرے آہ و نالہ کا اثر اُس پر نہیں ہوا تھا تو کم از کم خود مجھ پر اس کا اثر ہوتا اور میں اپنے حال پر رحم کھا کر نالہ کشی سے باز رہتا لیکن معلوم ہوا کہ میرا نالہ بے اثر (اس لحاظ سے کہ محبوب کے دل میں کیفیت رحم نہ پیدا کر سکا) اتنا بے اثر ہے کہ خود مجھ پر بھی اس کا اثر نہ ہوا اور میں نالہ سے باز نہ آیا۔

غزل (۱۱۹)

۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ :- آزاد - بے پروا -

مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ تم محبت ہی کرو۔ تم عداوت ہی کرو لیکن ہو میرے ہی ساتھ - کوئی اور اُس میں شریک نہ ہو -

پہلا مصرعہ الجھا ہوا ہے - اگر وارستہ کے معنی بے پروا کے لئے جائیں تو پھر کیوں کے بعد نہ بیکار ہو جاتا ہے، اندازِ بیان یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس سے بے پرواہیں کہ تم محبت ہی کرو -

دوسرے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا اہلِ لکھنؤ کے ذوق کے مطابق ذم کا پہلو لئے ہوئے ہے -

---

۷۔ ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

انفعال یعنی کسی دوسرے کا اثر قبول کرنا یا اس سے کچھ حاصل کرنا، ہمت کی کمی کی دلیل ہے، یہاں تک کہ اگر زمانہ سے عبرت حاصل کی جائے تو وہ بھی گو یا زمانہ کا احسان لینا ہوگا اور یہ دونِ ہمت ہے - پہلے مصرعہ میں لفظِ ہنگامہ محض برائے بیت استعمال ہوا ہے ورنہ بغیر اس کے بھی شعر کے معنی پورے ہو جاتے ہیں -

---

۸۔ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی :- آزادی - وحشت -
بیگانگی :- مغائرت و ناآشنائی

مفہوم یہ ہے کہ آزادی یا آزادہ روی اہلِ دنیا سے بیگانہ رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ سے وحشت کرنے کا نام ہے -

مفہوم یہ ہے کہ صحیح آزادی خود اپنے آپ کو اغراض سے آزاد رکھنے کا نام ہے

یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی کوئی غرض وابستہ نہ ہونا چاہیئے۔

غزل (۱۲۲)

۲۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تاکہ:۔ جب تک

نخچیر:۔ شکار

یعنی اس کا ذوقِ ستم تو دیکھئے کہ جب تک دیدۂ نخچیر کا آئینہ سامنے نہ ہو وہ اپنی شکل دیکھتا ہی نہیں۔

جب کوئی جانور مر جاتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور ان سے حیرانی کا اظہار ہونے لگتا ہے جس کی تعبیر آئینہ سے کی گئی ہے۔

غزل (۱۲۳)

۱۔ وال پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

صد رہ:۔ سو سو طرح سے۔

آہنگ:۔ ارادہ

پئے ہم:۔ پیہم، متواتر۔ فارسی میں پئے ہم بھی مستعمل ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اس کے کوچہ میں پہنچ کر جو ہم کو غش بار بار آتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سو سو بار اُس کا نشانِ قدم چومنے کو زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔

اگر قدم سے مراد خود اپنا قدم ہو تو مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اپنا نقش قدم چومنا چاہتے ہیں۔

اس لئے کہ وہ کوچۂ یار تک پہونچ سکا۔

۲۔ دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے

کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو

ہم = باہم

مفہوم یہ ہے کہ میں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو محوِ وفا رکھتے ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں ذوقِ گرفتاری کتنا مشترک ہے۔

۳۔ ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن

تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

پئے مور :۔ پائے مور ۔ چیونٹی کا پیر

رم :۔ بھاگنا ۔ گریز کرنا ۔ فرار

مفہوم یہ ہے کہ تیرے کوچہ سے بھاگ کر کہیں اور چلا جانا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے ضعف کا یہ عالم ہے کہ تیرے کوچہ میں پائے مور کا نشان بھی طوق گردن سے کم نہیں اور وہ ہمیں جانے سے باز رکھتا ہے۔

۵۔ رشک ہمطرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں

نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

ہمطرحی :۔ ہمسری

پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑوں کا تعلق نالۂ مرغِ سحر سے ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ نالۂ مرغِ سحر میرے لئے دو دھاری تلوار ہے۔ یعنی ایک تکلیف تو مجھے

اس رشک سے ہوتی ہے کہ وہ بھی میری ہی طرح نالہ کرتا ہے اور شاید تیرا شیدائی ہے اور دوسری تکلیف یہ کہ اُس کی آواز میں اثر ہے اور میری آواز میں نہیں ہے۔

۹۔ بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

اس شعر میں بڑی معیوب تعقید ہے۔ پہلے مصرعہ میں قرار فاعل ہے "کیونکر ہو" کا جو دوسرے مصرعہ کا قافیہ و ردیف ہے۔

اس کی نثر یوں ہوگی۔ (اگر) اس مژہ کو دیکھ کر بتاؤ کہ اگر یہ نشتر رگِ جاں میں فرو ہو تو مجھ کو قرار کیوں کر ہو (یعنی میں کیوں نہ بے قرار ہوں)۔

غزل (۱۳۳)

۱۔ ہے بزمِ بتاں میں سخن، آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا:۔ بات نہ کر سکنا

اس شعر کے سمجھنے میں عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ لبوں سے سخن کی آزردگی کو خود غالب سے منعلق سمجھا جاتا ہے اور اس طرح مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں حالانکہ اس کا تعلق بتوں سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بزمِ بتاں کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ اُن کی خوشامد کی جائے تو وہ کچھ بولیں۔ اس لئے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے سخت تنگ آگئے ہیں۔

۲۔ رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

طرف :- فارسی میں مقابل کو کہتے ہیں۔
یعنی اے زاہد رندوں کے منھ کبھی نہ لگنا۔ یہ بڑے بے ادب اور منھ پھٹ ہیں۔

۴۔ بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

مفہوم یہ ہے کہ ہر چند میری جان کا تعلق صرف لبوں سے باقی رہ گیا تھا (یعنی جان لبوں پر رہا کرتی تھی) لیکن تقاضائے وفا کا ظلم دیکھیے کہ اسے یہ بھی گوارا نہ ہوا اور جان و لب کا تعلق بھی اس نے توڑ دیا۔

غزل (۱۳۶)

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

پرنیاں :- ریشمی کپڑا جس سے آگ فوراً لپٹ جاتی ہے۔
مدعا یہ کہ آگ، پرنیاں میں لپٹ کر تو اپنے آپ کو چھپا سکتی ہے میں اپنے سوزِ غم کو کسی طرح نہیں چھپا سکتا۔

غزل (۱۳۷)

۱۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی :- آرزو کرنا
ڈوبی ہوئی اسامی :- وہ کاشتکار جس سے لگان وصول نہ ہوسکے۔
مفہوم یہ ہے کہ جوشِ گریہ سے کوئی امید کامیابی کی قائم کرنا بے کار ہے کیونکہ اک ڈوبی

ہوئی اسامی کی طرح اس سے بھی کچھ وصول نہیں ہو سکتا۔

غزل (۱۲۸)

۲۔ حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

سیلی :۔ تھپڑ۔ ضرب

خارا :۔ پتھر

مفہوم یہ ہے کہ میرا شیشہ تو پتھر کی ضرب سے لالہ رنگ ہے لیکن غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس میں شراب بھری ہوئی ہے۔ ناقص شعر ہے۔ کیونکہ پتھر کی ضرب سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لالہ رنگ نہیں ہو سکتا اور اگر شیشہ سے مراد دل لیا جائے تو پھر پتھر کی ضرب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۴۔ کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

گرم کا تعلق سینہ سے نہیں ہے۔

جا گرم کردن کا مفہوم فارسی میں قیام کرنے اور بیٹھنے کا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اُس نے سینہ اہل ہوس میں اس لئے اپنی جگہ بنائی ہے کہ وہ ٹھنڈا یعنی گرمیٔ عشق سے خالی ہے اور قیام کے لئے عموماً ٹھنڈی جگہ ہی کو پسند کیا جاتا ہے۔

۷۔ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

مفہوم یہ ہے کہ غم کی شدت نے جگر کو اتنا مٹا دیا کہ اب اُس کی جگہ صرف داغ رہ گیا

ہے اس لئے اگر میں کسی سے یہ کہوں بھی کہ یہ داغِ جگر کا نشان ہے تو اُسے کون مانے گا۔

غزل (۱۴۱)

۱۔ اگر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

یعنی اگر لوگ اپنی خاموشی سے یہ فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ اُن کا حال کسی پر ظاہر نہ ہو تو میں بھی اپنی گویائی سے خوش ہوں کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی لوگ نہیں سمجھ سکتے یعنی جو فائدہ دوسرے لوگ خاموشی سے حاصل کرتے ہیں وہ میں اپنی گویائی سے حاصل کرتا ہوں۔ گویا اوروں کی خاموشی اور میری گویائی بہ لحاظ نتیجہ دونوں ایک ہی سی ہیں۔

اس میں غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری شاعرانہ بلند خیالی تک مشکل ہی سے کوئی شخص پہونچ سکتا ہے۔

۲۔ کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

فردِ جمع و خرچ :۔ اُس کاغذ کو کہتے ہیں جس میں جمع و خرچ کا حساب درج ہوتا ہے (بہی کھاتہ)۔ یہاں مراد محض دفتر یا ریکارڈ ہے۔

زبانہائے لال :۔ گونگی زبانیں۔

اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے کروں جب کہ خود میرا ہی دل اظہارِ حال سے قاصر ہے۔ اس صورت میں "زباں ہائے لال" سے خود غالب کی گنگ زبان مراد ہوگی۔ لیکن اگر "زباں ہائے لال" کا تعلق دوسروں سے ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ جب لوگ میرا حال پوچھتے ہی نہیں۔ تو پھر میں حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے

کردن۔ زیادہ قرینِ قیاس یہی مفہوم ہے۔ گو اس صورت میں "زباں ہائے لال" بصورتِ جمع استعمال کرنے کا کوئی محل نہیں ہے۔

۳۔ کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز، اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

آئینہ پرداز:۔ محوِ آرائش
رحمت کے بعد لفظ "کر" محذوف ہے۔

شاعر خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو کس پردہ میں محوِ آرائش ہے۔ سامنے آ اور اس کا انتظار نہ کر کہ میں عذرِ گناہ پیش کروں۔ کیونکہ میرا لبِ بے سوال (یعنی میرا کچھ نہ کہنا) ہی میری بڑی معذرت ہے جس پر تجھے رحم کرنا چاہیئے۔ مدعا یہ کہ جو کچھ دینا ہے۔ بے طلب دے۔ سوال کا انتظار نہ کر۔

۴۔ ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

دوسرے مصرع میں "شوقِ منفعل" غور طلب ہے۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہو اور منفعل کو شوق کی صفت قرار دیا جائے تو پہلا مصرعہ بے معنی سا ہو جاتا ہے کیونکہ جب شوق خود محبوب کے خیالِ دشمنی پر منفعل ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ "ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی"! اس لئے اگر شوق اور منفعل دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھ کر منفعل کے بعد لفظ "ہو" محذوف تسلیم کیا جائے تو البتہ پہلا مصرعہ اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اے شوق تیرا خیال کہ محبوب تیرا دشمن ہے صحیح نہیں اور اس بدگمانی پر تجھے منفعل (شرمندہ) ہونا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے دوسرا مصرع یوں ہو ع اے شوق منفعل ہو۔ تجھے کیا خیال ہے۔

۵۔ مشکیں لباسِ کعبہ، علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مشکیں لباس سے سیاہ لباس نہیں، بلکہ مشک کی سی خوشبو دینے والا لباس مراد ہے۔
ناف زمین سے مراد مرکزِ زمین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ نافِ زمین ہے۔
نافِ غزال: ہرن کی ناف جس کے اندر مشک پیدا ہوتا ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ کعبہ کے لباس سے اگر مشک سی خوشبو آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ وہاں پیدا ہوئے تھے، ورنہ کعبہ گو نافِ زمین سہی مگر نافِ غزال تو نہیں کہ اس سے مشک کی خوشبو پیدا ہو۔

۶۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

عرصۂ آفاق سے مراد عرصۂ زمین ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ زمین کی وسعت میری وحشت و صحرا نوردی کے لئے اتنی تنگ تھی کہ زمین ہم کو دیکھ کر شرم سے پسینہ پسینہ ہوگئی اور دریائے عرقِ انفعال بن گئی۔

۷۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
دنیا تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالبؔ اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہستی یا عالمِ موجودات کے فریب میں نہ آجانا۔ یہ سراسر وہم و خیال ہے اُن کا وجود بظاہر کہیں نہیں۔

غزل (۱۴۳)

۱۔ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار کاغذ وہ کاغذ ہے جس سے کوئی حرف بآسانی مٹایا جا سکے، لیکن یہاں خود کاغذ کو اس معنی میں غلط بردار کہا گیا ہے کہ وہ خود حرفِ غلط کو مٹا دیتا ہے۔

چونکہ محبوب نے اپنے خط میں کسی جگہ غلطی سے حرفِ وفا لکھ دیا تھا اس لئے وہ آپ ہی کاغذ سے مٹ گیا اور عاشق کو اس کی تردید کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

۲۔ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ کسی طرح یک دَم جل کے فنا ہو جائیں لیکن باوجود اس کے کہ ہمارا نفس آتش بار ہے ہم جل نہیں سکتے اور اس طرح ذوقِ فنا کے پورے نہ ہو سکنے پر ہمارا جی ہر وقت جلتا رہتا ہے۔

۴۔ ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

عذر خواہ، معذرت کرنے والا۔

مفہوم یہ ہے کہ جس کے جلوہ سے زمین تا آسماں مست و سرشار ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں کے ہر ہر ذرہ کو مست و سرشار ہونا چاہیئے۔

۵۔ مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

غالبؔ نے یہ شعر بالکل مومنؔ کے رنگ میں کہا ہے۔

غالبؔ معشوق سے کہتا ہے کہ اب تو مجھے یہ بات یاد نہ دلا کہ میں تجھے اپنی زندگی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ آج کل میں زندگی سے بیزار ہوں۔

غزل (۱۴۵)

۱۔ مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

مفہوم یہ ہے کہ تمناؤں کے ہجوم نے مجھے حیرت کدہ بنا دیا ہے اور عالمِ حیرت میں انسان خاموش رہتا ہے اس لئے نالہ و فریاد کا کیا ذکر۔

نالہ و فریاد کو عالمِ حیرت کا عُنقا کہنا اس بنیاد پر ہے کہ عُنقا کا بس نام ہی نام ہے۔ بظاہر اس کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا۔

۴۔ نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

جب انسان مایوس ہوتا ہے تو کفِ افسوس ملتا ہے اور جب باہم عہد و پیمان ہوتا ہے تو بھی ہاتھ سے ہاتھ ملایا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ عالمِ یاس میں کفِ افسوس ضرور ملتا ہوں لیکن چونکہ ناامیدی اور یاس کی تکلیف میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ میرا کفِ افسوس ملنا ناامیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تجدیدِ تمنا کا عہد و پیمان ہے۔

غزل (۱۴۶)

۱۔ رحم کر ظالم کہ کیا بُودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے

بود :۔ ہستی

چراغ کشتہ :۔ بجھا ہوا چراغ۔

دُود :۔ دھواں۔

غالب نے چراغ کشتہ عنقریب بجھ جانے والے چراغ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے بجھے ہوئے چراغ کے مفہوم میں نہیں ورنہ طلبِ رحم کا فقرہ بے کار ہو جاتا۔

مدعا یہ کہ ترا بیمارِ وفا اب زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور چند گھڑی کا مہمان ہے اس لئے اس وقت تو تجھے رحم کرنا ہی چاہیئے

نبض کو دُودِ چراغِ کشتہ سے تشبیہہ دینا اس بنا پر ہے کہ اطبا آخری وقت کی نبض کو نبضِ دُودی کہتے ہیں۔

۲۔ دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یہ بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

چراغ کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ بجھ جائے (بے رونق ہو جائے) کیوں کہ اس سے اس کا جلنا ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ جب ایک آرزو فنا ہوتی ہے تو دوسری آرزو پیدا کر لیتے ہیں اور اس چراغ کو بجھنے نہیں دیتے۔

غزل (۱۴۷)

۱- چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

اپنی آنکھوں کو نوا پرداز کہنا اسی بنا پر ہے کہ باوجود خامشی کے ان میں ایک ایسی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہوں لیکن اس خیال کے اظہار کے لئے غالب کی دشوار پسند فطرت نے شعلۂ آواز اور سرمہ کی صورت میں اس کے لئے دھواں بھی پیدا کر دیا ورنہ اصل مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ معشوق کی سرمہ آلود آنکھیں باوجود کچھ نہ کہنے کے بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔

۲- پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

غالب نے اس شعر میں نہایت ناگوار مبالغہ و تعبیر سے کام لیا ہے۔ عشاق عاشق کی جمع ہے اور ایک فارسی راگنی کا بھی نام ہے اس لئے اس کو سامنے رکھ کر غالب نے ساز بھی پیدا کیا اور "طالع ناساز" کی رعایت سے ناموافق سیارہ بھی ڈھونڈھ نکالا اور پھر اپنے نالہ کو اسی سیارہ کی آوازِ گردش قرار دیا ہے۔ ورنہ صرف کہنا یہ تھا کہ ہماری آہ و زاری کا سبب صرف ہماری ازلی بدنصیبی ہے اور ہم پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ نالہ و فریاد کرتے رہیں۔

۳- دستگاہ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ - قدرت۔ کمال۔

یک بیاباں جلوۂ گل: ایک وسیع تختۂ گل۔

فرش پا انداز: وہ فرش جو کسی کے خیر مقدم کے لئے اُس کی راہ میں بچھایا جاتا ہے اور عموماً سُرخ کپڑے کا ہوتا ہے۔

کہنا صرف یہ ہے کہ مجنوں نے اپنی چشم خونبار سے سارے دشت کو رنگین بنا دیا ہے لیکن اس کو ظاہر اس طرح کیا ہے کہ دشت میں جو وسیع جلوۂ گل نظر آتا ہے وہ مجنوں کی خونبار آنکھوں کا پیدا کیا ہوا ایک فرشِ پا انداز ہے۔

۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

اس غزل میں ردیف (ہی سہی) کا استعمال آسان نہ تھا اور مطلع کے دوسرے مصرعہ میں غالب بھی ردیف کا صحیح استعمال نہ کر سکے۔ "ہی سہی" ہمیشہ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی نامناسب یا گری ہوئی بات کو بدرجۂ مجبوری تسلیم کر لیا جائے۔

اب اس شعر کے مفہوم پر غور کیجیے۔

غالب جب اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں تو معشوق بگڑ کر کہتا ہے کہ یہ عشق نہیں وحشت ہے غالب یہ سن کر معشوق سے کہتے ہیں۔ چلو عشق نہیں وحشت ہی سہی لیکن اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ میری یہی وحشت تمھاری شہرت کا باعث ہے۔

۲۔ میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ معشوق ایک مجلس منعقد کرتا ہے لیکن اس میں غالب کو باریابی کی

اجازت نہیں ملتی۔ غالب شکایت کرتے ہیں تو معشوق کہتا ہے کہ یہ کوئی مجلس نہیں ہے بلکہ خلوت کی ایک صحبت ہے اس پر غالب کہتے ہیں۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۲) دوسرا مفہوم یہ کہ مجلس میں غالب کو شرکت کی اجازت نہیں دیتا اور کہتا ہو کہ تمھاری شرکت سے رسوائی کا اندیشہ ہے اس پر غالب کہتے ہیں کہ اس میں رسوائی کی تو کوئی بات نہیں لیکن اگر تم ایسا ہی سمجھتے ہو تو مجلس نہ سہی خلوت ہی میں بلالو"۔

۴۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے جس میں بالکل نئے انداز سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

غالب نے غیر سے محبوب کی رسم وراہ دیکھ کر کہا کہ تو اُس سے کیوں ملتا ہے جب کہ وہ تجھ سے محبت نہیں بلکہ صرف محبت کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب نے کہا کہ "نہیں تم غلط کہتے ہو اُسے واقعی مجھ سے محبت ہے۔" یہ سُن کر غالب نے کہا کہ "چلو مان لیا کہ غیر کو تم سے محبت ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ مجھے محبت نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ سے میرا محبت نہ کرنا خود اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص آپ اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ یعنی غیر کا تجھ سے محبت کرنا تو صرف لطفِ صحبت کے لئے ہے، لیکن میرا محبت کرنا تو میری مجبوری ہے کیونکہ وہی میری زندگی ہے۔

۵۔ اپنی ہی ہستی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

اپنی ہستی سے آگہی بھی عرفانِ حق ہے اور اپنے آپ سے غفلت (یعنی اپنے آپ کو

بھلا دینے یا مٹا دینے) کا نتیجہ بھی نہ ہی ہے۔

مدعا یہ کہ معرفتِ خداوندی کا تعلق اپنی ہی ذات سے ہے خواہ ہم آگاہی سے کام لیں یا غفلت سے۔

غفلت کا لغوی مفہوم بھلا دینے یا ترک کر دینے کا ہے۔

غزل (۱۴۹)

۱۔ ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

آرمیدگی:۔ آرام طلبی

نکوہش:۔ ملامت

میری آرام طلبی یقیناً قابلِ ملامت ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ صبحِ وطن بھی مجھ پر از راہ طنز ہنس رہی ہے۔ صبح کو "خندۂ دنداں نما" کہنے کی وجہ ظاہر ہے۔

۴۔ کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

نکہتِ گل سے حیا آنے کا سبب یہ ہے کہ وہ باغ میں محبوب کی بے حجابیوں کی یاد دلا دیتی ہے اور چونکہ باغ میں بے حجابیوں سے کام لینا گویا سرِ عام بے حجاب ہو جاتا ہے اس لئے عاشق کو معشوق کی اس عدمِ حیا پر حیا آنا ہی چاہیے۔

غزل (۱۵۲)

۱۔ رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

سال سے مراد عمر ہے۔

دنیا میں عمر بسر کرنا گویا انتہائی اضطراب اور بے چینی کے دن کاٹنا ہیں۔ اس لئے عمر کا حساب آفتاب کی گردش سے نہیں بلکہ تابشِ برق سے کرنا چاہیئے۔

۲۔ مینائے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے

بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے

تدرو:۔ چکور

غالب نے اس شعر میں اپنے لُطفِ میخواری کا ذکر کیا ہے اور استعارتاً مینا کو سرو اور موجِ شراب کو "بالِ تدرو" قرار دے کر گویا باغ کا سماں پیدا کیا ہے۔

۴۔ نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا

جوشِ بہار، جلوہ کو جسکے نقاب ہے

اُس حُسنِ برق پاش کا نظارہ جس کا نقاب خود بہار ہو کون کر سکتا ہے۔

برق کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ اگر برقِ حُسن کی جگہ جانِ حُسن کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

غزل (۱۵۳)

۲۔ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس شعر میں دل کی تعبیر آبگینہ سے اور اندیشہ کی تندیِ صہبا سے کی گئی ہے۔

اندیشہ فکر و تامل کو کہتے ہیں لیکن یہاں خیال کی بلندی مراد ہے۔

مدعا یہ کہ اگر میری گرمیٔ خیال کا یہی عالم رہا تو میں خود اس سے فنا ہو جاؤں گا جیسے شراب کی تیزی سے شیشہ پگھل جائے۔

غزل (۱۵۴)

۱۔ گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

شکل نہالی :۔ قالین یا بستر کے نقش و نگار
بردِ لیالی :۔ راتوں کی سردی

ہجر کی راتیں میرے لئے اس قدر سرد تھیں کہ اگر بستر کی تصویروں کو دیکھ کر مجھے محبوب کی یاد نہ آجاتی اور میں اس کو یاد کر کے سرگرمِ فریاد نہ ہوتا تو زندہ نہ رہتا۔

۲۔ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

نسیہ :۔ قرض
دو عالم :۔ دنیا و عقبیٰ

نقد سے مراد دنیا ہے اور نسیہ سے عقبیٰ۔ مفہوم یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں دنیا و عقبیٰ کا سودا کس طرح ہوا کرتا ہے، اس لئے میری ہمتِ عالی نے یہ سودا گوارا نہ کیا اور مجھے دین و دنیا کسی کے ہاتھ بکنے نہ دیا۔

۳۔ کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر، ان اصنامِ خیالی نے مجھے

"کثرت آرائیٔ وحدت" سے مراد دوست کو کثرت میں جلوہ گر دیکھنا ہے۔ مدعا یہ کہ واجب الوجود کا یہ تصور کہ وہ ہر چیز میں نمایاں ہے محض وہم پرستی اور خیالی اصنام تراشی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا عالم خود کلی حیثیت سے خدا ہے اور یہ سمجھنا کہ خدا فلاں فلاں صورتوں میں جلوہ گر ہے، جذبۂ وحدت پرستی کے منافی ہے۔

غزل (۱۵۵)

۱۔ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

مدعا یہ کہ دنیا میں انسانی سعی و عمل کا مآل رنج و الم کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً لالہ کو دیکھئے کہ دہقان کس محنت سے لالہ اُگاتا ہے لیکن جب وہ اُگتا ہے تو وہ یکسر داغ نظر آتا ہے۔

۲۔ غنچہ تاشگفتنہا، برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

غنچہ کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پنکھڑیاں ایک جگہ سمیٹے ہوئے بڑا مطمئن سا ہے لیکن یہ اُسی وقت تک ہے جب تک وہ پھول نہیں بنا ادھر پھول بنا اور اُس کی پنکھڑیاں منتشر ہوئیں۔

۳۔ ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

خس بدنداں ہونا: اظہارِ عجز کرنا۔ "پشت دست بر زمیں نہادن" فارسی میں کورنش یا اظہارِ فروتنی کو کہتے ہیں۔

شعلہ کو "خس بدنداں" اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ خس و خاشاک ہی سے پیدا ہوتا ہے اور داغ کو "پشتِ دست" کہنا اُس کی ظاہری حالت کے لحاظ سے ہے۔

مُدعا یہ کہ جس دنیا میں داغ و شعلہ کی عاجزی کا یہ عالم ہو وہاں رنجِ بیتابی و ناکامی اُٹھانا کتنا مشکل ہے۔

غزل (۱۵۷)

۵۔ رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

واماندگی: خستگی۔ مراد اپنی واماندگی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب منزل میں ہمارے قدم انتہائی خستگی کی وجہ سے نہیں اُٹھتے تو ہم کیوں رنجِ رہ نوردی اختیار کریں۔

مدعا یہ کہ اس دنیا کی تگ و دَو محض سعی بے حاصل ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان بہ حالت مایوسی ایک جگہ تھک کر بیٹھ جائے۔

۶۔ جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

معشوق نے غالبؔ سے کہا کہ تیرے دل میں آتشِ دوزخ بھری ہوئی ہے۔ غالب نے

کہا ہاں یہ ایسا ہی ہو گا جیسا تو کہتا ہے لیکن یہ تو بتا کہ فتنۂ شورِ قیامت کا تعلق کس کے خمیر سے ہے، میرے یا تیرے؟

غزل (۱۶۴)

۸۔ کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

ہم نفس :- ساتھی :- احباب۔ اس شعر میں کئی باتیں محذوف ہیں۔
غالبؔ کے احباب نے محبوب کے پاس جا کر غالبؔ کی شدتِ گریہ و زاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا اثر کہاں تک نہ ہو گا۔ اس پر محبوب نے کہا کہ گریہ و زاری کے اثر کا خیال غلط ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مجھ پر اس کا اثر ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ یہ دلیل سُن کر غالبؔ کے احباب نے بھی اس کی تصدیق کی اور لوٹ کر غالبؔ سے سارا حال بیان کیا۔ غالبؔ نے یہ ساری داستان سُن کر یہ شعر کہا۔

غزل (۱۶۵)

۱۔ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمکِ پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

اگر کچھ زمانہ ہم نے خوشی سے گزار لیا اور تھوڑی بہت زندگی کی لذت حاصل کر لی تو اس سے ہمارے ذوقِ جنوں پر تسکین کی تہمت نہ رکھنا چاہیئے کیونکہ زندگی کی عارضی لذت تو اور زیادہ زخمِ دل پر نمک چھڑکتی ہے۔ پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے میں "نہ ہو" "یہ کیوں نہ ہو" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ کُنَد کشِ ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

ہستی کی کشمکش سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ اس سے آزادی ممکن نہیں۔ مثلاً پانی کی موج کو دیکھئے کہ وہ روانی کے لئے آزاد ہے لیکن پھر بھی اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔
(موجوں کی صورت زنجیر کی سی ہوتی ہے)۔

۳۔ پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

میرے مرنے کے بعد بھی میری قبر لڑکوں کی جولاں گاہ بنی ہوئی ہے جس پر وہ پتھر پھینکتے ہیں اور ان پتھروں سے جو شرارے نکلتے ہیں وہ گویا پھول ہیں جو میری تربت پر چڑھائے جاتے ہیں۔
مدعا یہ کہ میری تربت پر شرر افشانی بھی گل افشانی کی صورت رکھتی ہے۔

غزل (۱۶۶)

۱۔ نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

معشوق کے ظلم کی فریاد قابلِ ملامت چیز ہے، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن میں محبوب کے ظلم کی فریاد کروں اور صبحِ محشر میری ہنسی اڑائے۔

۲۔ رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

مشہور ہے کہ ایک بار لیلیٰ نے فصد کھلوائی تو مجنوں کی رگ خون دینے لگی۔ اسی روایت کے پیشِ نظر غالبؔ نے یہ شعر کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر دہقاں، دشتِ مجنوں میں دانہ کی جگہ نوکِ نشتر بو دے تو عجب نہیں کہ رگِ لیلیٰ ابھی اُس کی خلش محسوس کرنے لگے۔

۳۔ پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

ہر مجلس میں شمع روشن کی جاتی ہے جس پر پروانے آ آ کر گرتے ہیں اور پھر دورِ شراب چلتا ہے اُس کو سامنے رکھ کر غالبؔ نے پرِ پروانہ کو کشتیٔ مے کا بادبان فرض کیا اور اس کشتی کی روانی کو دورِ ساغر سے ظاہر کیا۔ نہایت دُور از کار اور بے لطف تخئیل ہے۔

۴۔ کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی:۔ پرواز۔ پر پھڑپھڑانا
شہپر:۔ سب سے بڑا پر جس کی مدد سے طائر اُڑتا ہے۔
اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ بہت کم عمری ہی میں میں نے ذوقِ پرواز میں اپنے پر اس قدر پھڑپھڑائے کہ جب اُڑنے کا زمانہ آیا تو معلوم ہوا کہ شہپر بیکار ہو چکا ہے اور یہ اتنا بڑا ظلم میرے شوقِ پرواز کا ہے جس کا اظہار ممکن نہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ذوقِ پرواز سے مجبور ہو کر میں نے اُڑنے کا قصد کیا تو معلوم

ہوا کہ شہپر پہلے ہی سے بیکار ہیں۔ دراصل یہ ظلم بھی مجھ پر ذوقِ پرواز کا ہے کیونکہ اگر وہ مجھے
مجبور نہ کرتا تو مجھ کو احساسِ بے پر و بالی بھی نہ ہوتا۔

غزل (۱۶۷)

۲۔ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

اس شعر کی بنیاد اُردو کے ایک محاورے پر قائم ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی چیز بہت
کم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ "بس قسم کھانے کو ہے"۔ یعنی اتنی کم ہے کہ اگر ہم سے کوئی قسم نہ
کھلوائے تو ہم اُس کے وجود سے انکار کر دیں۔
اس شعر میں غالبؔ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بالکل مٹ چکے ہیں اور ہماری ہستی
صرف کہنے کو رہ گئی ہے۔ پہلے مصرعہ میں لفظِ دلیل بہ معنی حجت و برہان استعمال نہیں ہوا
بمعنی رہنمائی واشارہ لایا گیا ہے۔

۷۔ اللہ ری تیری تندئ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

دوسرے مصرعہ میں "رزقِ ہم" کا مفہوم عام طور پر "رزقِ باہم" سمجھا جاتا ہے۔ یعنی
اجزائے نالہ نے ایک دوسرے کو کھا لیا یہ بڑی مضحک سی بات ہے۔ "ہم" کے معنی "غم و الم"
کے ہیں۔ اس لئے شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ تیری تندخوئی و برہمی کے خوف سے میرا نالہ باہر نہ آسکا
اور وہ دل ہی دل میں گھٹ کر نذرِ غم ہو گیا۔

۸۔ اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علَم ہوئے

غالب کا شعر بالکل ناسخ کے رنگ کا ہے جس میں محض ایک لفظ "اُٹھ گئے" کو سامنے رکھ کر نہایت رکیک سی بات کہہ دی۔

عَلَم ہونا، بلند ہونے کو بھی کہتے ہیں اور پاؤں اُٹھنے میں بھاگ کھڑے ہونے کے علاوہ بلند ہونے کا مفہوم بھی پنہاں ہے اس لئے اس ایہام کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا گیا ہے۔

۹۔ نالے عَدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو یہاں آ کے دَم ہوئے

دَم:۔ سانس

مفہوم یہ ہے کہ عدم میں ہم کو یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ نالے کرتے رہیں۔ لیکن جتنے نالے مقسوم ہو چکے تھے وہ سب کے سب دنیائے عدم میں کھنچ نہ سکے۔ اس لئے دنیائے وجود میں آ کر وہ ہم کو پورے کرنے پڑتے ہیں اور اب ہماری ہر سانس نے نالہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہماری زندگی نالہ و فریاد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

غزل (۱۶۸)

۱۔ جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

یہ شعر بھی حُسنِ تعبیر سے معرا ہے۔ نقد کا فسردگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح "شعلہ کی پاسبانی" بھی "نقدِ داغِ دل" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ خزانہ کی حفاظت کے لئے آگ روشن نہیں کی جاتی بلکہ قدیم روایات کے مطابق یہ خدمت سانپ کے سپرد کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں

میزبانی بھی" نقدِ داغِ دل" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔
اگر پہلے مصرعہ میں "نقدِ داغِ دل" کی جگہ "لالہ زارِ دل" ہوتا تو یہ نقائص ایک حد تک دور ہو سکتے تھے۔

غزل (۱۶۹)

غالب کی یہ غزل غزل بھی ہے اور مرثیہ بھی اور دونوں حیثیتوں سے بہت کامیاب، اگر اس کے دوسرے تیسرے اور چوتھے شعر کو نکال دیا جائے تو پوری غزل مرثیہ ہو جاتی ہے جس میں "عہد بہادر شاہ ظفر" کی تصویر نہایت حسرت آمیز لب و لہجہ میں کھینچی گئی ہے۔

۱۔ ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
ایک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

"شبِ غم کا جوش" بقول غالب انتہائی تاریکی ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے دوسرے مصرعہ میں اس شدید تاریکی کا ثبوت یہ دیا گیا ہے کہ شمع جو دلیلِ سحر ہو سکتی ہے وہ بھی خاموش ہے۔ اس شعر میں لفظ خموش سے ایہام کا لطف پیدا کیا گیا ہے کیونکہ خموش کے معنی ساکت ہونے کے بھی ہیں اور بجھی ہوئی شمع کو بھی خاموش کہتے ہیں۔ صبح کو عموماً شمع بجھا دی جاتی ہے لیکن غالب نے یہاں اس کے دوسرے معنی سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۲۔ نے مژدہ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

ایک زمانہ ہو گیا کہ نہ آنکھوں کو نظارۂ جمال کا موقع ملا اور نہ کانوں کو مژدہ وصال سننے کا، اس لئے اب چشم و گوش دونوں میں باہم صلح ہو گئی ہے اور ایک دوسرے پر رشک

نہیں کرتا۔ ورنہ پہلے یہ تھا کہ جب آنکھ کو نظارہ جمال کا موقع ملتا تھا تو کان اس پر رشک کرنے لگتا تھا اور جب کانوں کو مژدۂ وصال پہونچتا تھا تو آنکھ رشک کرتی تھی کہ پہلے مجھے کیوں نہ نظارۂ جمال کا موقع ملا۔

۳۔ مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے نقاب

اے شوق یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

"یاں" اس جگہ "اب" کے محل پر استعمال کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب معشوق نشۂ شراب کی وجہ سے بے حجاب ہو جائے تو شوق کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے ہوش کو رخصت کر دے اور بے باک ہو جائے۔

۴۔ گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا

کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

عِقد :- ہار، مالا

محبوب کے گلے کے ہار میں موتی دیکھ کر غالبؔ کو یہ خیال آیا کہ موتی کی خوش نصیبی تو ظاہر ہے کہ گردن خوباں سے متصل ہیں۔ لیکن جس نے یہ موتی فروخت کیا ہے وہ بھی کم خوش قسمت نہیں کیونکہ وہ نہیں تو کم از کم اُس کا موتی تو محبوب کی گردن تک پہونچ گیا۔

۵۔ دیدار بادہ۔ حوصلہ ساقی نگاہ مست

بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

دیدار کو بادہ قرار دیا، حوصلہ کو ساقی اور نگاہ کو بادہ خوار۔ مدعا یہ کہ خیال و تصور کا میکدہ بھی کتنا پُرسکون میکدہ ہے جہاں ہم حسنِ یار کا نظارہ کر کر کے مست ہو رہے ہیں

اور کوئی شور و ہنگامہ پیدا نہیں ہوتا

اس کے بعد سات اشعار مرثیہ کے انداز کے ہیں جس میں دِلّی کے اجڑنے کا حال نہایت لطیف و مؤثر لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہے۔

غزل (۱۷۱)

۱۔ ہجومِ غم سے یاں تک سر نگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

غم میں آدمی سر جھکا کے بیٹھ جاتا ہے، غالب اس غم کی شدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ میرا سر ہجومِ غم سے اتنا جھک گیا ہے کہ تارِ نگاہ تارِ دامن سے مل گیا ہے۔

۲۔ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندہ دل ہے

مفہوم یہ ہے کہ وہ گلُ (یعنی محبوب) جس گلستاں میں جلوہ فرما ہوتا ہے وہاں کی ہر کلی فرطِ مسرت سے چٹکنے لگتی ہے اور یہ چٹکنا اُس کا گویا خندۂ دل ہے۔

کلی کی مشابہت دل سے ظاہر ہے اور چٹکنے میں جو ایک آواز سی پیدا ہوتی ہے اُس کی تعبیر خندۂ دل سے کی گئی ہے۔

"جلوہ فرمائی کرنا" اچھی زبان نہیں کیوں کہ محض جلوہ فرمائی سے مفہوم پورا ادا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

"وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرما ہو وہاں غالبؔ"

غزل (۱۷۲)

۱۔ پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

"پا بدامن کشیدن" فارسی میں پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جانے اور آمد و شد ترک کر دینے کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

بسکہ :- چونکہ

آئینۂ زانو سے مراد خود زانو ہے۔

زانو کو آئینہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آئینہ کو زانو پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ زانو کی ہڈی آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ پاؤں سمیٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا ہوں اس لئے اپنی طبعی صحرا نوردی کی بنا پر میرے آئینۂ زانو، یعنی خود زانو میں پاؤں کے کانٹے جوہر آئینہ کی طرح اب بھی نمایاں ہیں یا یہ کہ آئینۂ زانو کے جوہر مجھے بالکل خارِ پا کی طرح نظر آتے ہیں۔ مدعا یہ کہ باوجود شکستہ پائی کے صحرا نوردی کی یاد دل سے نہیں نکلتی۔ جوہر آئینہ یا صیقلِ آئینہ سے کانٹوں کی تشبیہ ظاہر ہے۔

۳۔ دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہ آشنا تیرا سَرِ ہر مو مجھے

وصل و ہم آغوشی کے وقت شدتِ جذبات سے ایک عاشق ایسا محسوس کر سکتا ہے کہ معشوق خود اس میں اور وہ خود معشوق کے اندر سمایا جا رہا ہے۔ اسی جذبہ کو غالب نے اس

طرح بیان کیا ہے کہ ہم آغوشی کے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ محبوب کے جسم کا ہر ہر رونگٹا مجھ سے واقف ہے اور میں اس سے۔

غزل

۱۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

"صورتِ دیوار" سے مراد غالباً وہ نقوش و تصاویر ہیں جو دیوار پر نقش کی جاتی ہیں۔ مدعا یہ کہ جب تو کسی بزم میں آجاتا ہے تو تیری جاں بخش باتیں سُن کر دیوار کی تصویروں میں جان آجاتی ہے۔

اس شعر میں ایک دعویٰ کیا گیا ہے بغیر کسی دلیل کے اور غالب کے یہاں اس عیب کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ علاوہ اس کے کالبد کا استعمال بے محل ہے۔ کالبد یا قالب کے مفہوم میں جسمیت کا تصور ضروری ہے اور نقش یا تصویر میں کوئی جسم نہیں ہوتا۔ ہاں اگر صورتِ دیوار سے مراد خود دیوار ہو تو مفہوم یہ ہوگا کہ خود دیوار میں جان آجاتی ہے اور اس مفہوم کی رکاکت ظاہر ہے لیکن اگر صورتِ دیوار سے اُبھرے ہوئے نقوش مراد ہوں تو البتہ کالبد کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس طرح صورت کا استعمال واحد میں غلط ٹھہرے گا۔ صور بہ حالتِ جمع ہونا چاہیئے۔

۴۔ وے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

پہلے تم مجھے شکایت کا موقع تو دو کہ اس پر تمھیں غصہ آئے اور مجھ پر زیادہ ظلم کرو۔ یوں بے وجہ ستانے میں کیا لُطف ہے۔

میری شکایت کے بعد جب تم کو غصہ آئے گا تو جذبۂ تعزیر و انتقام کے زیرِ اثر ظلم بھی شدید ہوگا اور ظلم کی شدت ہی میری عین تمنا ہے۔

۵۔ اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

طوطی کے سامنے آئینہ رکھ کر اُس کو بولنا سکھایا جاتا ہے اس لئے طوطی کے ساتھ آئینہ کا ذکر تو دُرست ہے لیکن خود آئینہ کا چشمِ فسوں گر کے اشارے سے گفتار میں آجانا لایعنی سی بات ہے۔ آئینہ کا گفتار سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سکوت و حیرانی سے ہے۔
آئینہ کی حیرانی و سکوت کا چشمِ فسوں گر کے اشارہ سے گفتگو میں تبدیل ہوجانا عجیب بات ہے۔

غزل (۱۷۵)

۴۔ نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلےٰ نہ سہی

سیہ خانہ:- مطلق خیمہ کو کہتے ہیں۔ سیاہ رنگ سے اُس کا کوئی تعلق نہیں لیکن غالب کو لفظِ سیہ سے شمع اور چشم و چراغ کے استعمال کا موقع مل گیا۔
مفہوم یہ ہے کہ اگر قیس خیمۂ لیلیٰ کی شمع نہیں بن سکتا تو کیا مضائقہ، وہ رونقِ صحرا تو ہے۔

غزل (۱۷۷)

۱۔ شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہئے تو گلہ ہوتا ہے"

دوسرے مصرع میں یہ کا اشارہ پورے اس فقرے کی طرف ہے "جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے"
خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ وہ بے مہر شکوہ کیا، شکوہ کے نام سے بھی خفا ہوتا ہے۔

۳۔ گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو! شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

میں جب شکوۂ جور کرتا ہوں تو وہ اور زیادہ جور پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ میرا مقصود ہی یہ ہے کہ میں شکوۂ جفا کروں اور وہ اس شکوہ سے خفا ہو کر اور زیادہ جفا مجھ پر کرے۔

۶۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برُا ہوتا ہے

ہماری ہر تمنا اُلٹی ہو جاتی ہے یعنی اگر ہم بھلا چاہتے ہیں تو برُا ہو جاتا ہے اس لئے خوب ہوتا اگر ہم پہلے ہی برُا چاہتے اور اس طرح اپنا بھلا ہو جاتا۔

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے:-

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

غزل (۱۸۲)

۱۔ تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

غالب کا یہ شعر بہت اُلجھا ہوا ہے اور مشکل سے کھینچ تان کر اس میں کوئی مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مقصود صرف عالی ظرفی کا اظہار ہے جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص میری طرف سے پہلو تہی بھی کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری جگہ بدستور

خالی ہے۔

غالب نے صرف لفظ تنی سے فائدہ اُٹھا کر "جامیری خالی" کا اظہار کیا اور ایہام گوئی کی یہ کوئی اچھی مثال نہیں۔

۲- رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بڑا پاکیزہ شعر ہے اور اس میں نہایت نازک و لطیف تخیل سے کام لیا گیا ہے۔

کہتا ہے کہ عالم کی آبادی و رونق صرف اس لئے قائم ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ عجیب دعوائے تھا لیکن غالب نے نہایت خوبصورتی سے اس کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ میخانہ کو دیکھو۔ اگر اس کے جام و سبو بھرے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میخانہ میں کوئی پینے پلانے والا نہیں۔ ورنہ اگر کوئی باہمت ساقی ہوتا تو جام سب خالی ہو جاتے اور میخانہ میں خاک اُڑنے لگتی۔

غزل (۱۸۳)

۲- خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

اپنے غمزۂ خونریز کی خلش کا حال مجھ سے نہ پوچھ بلکہ میری خونابہ فشانی دیکھ کر خود سمجھ لو کہ اس خلش نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔

۴- ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

بیدائے خیال:- صحرائے خیال

مفہوم یہ ہے کہ میں خیال کی دنیا میں گم ہو چکا ہوں اس لئے مجھے بھلا دینا ہی مجھے یاد

کرتا ہے۔

۵ متقابل ہے مقابل میرا — رُک گیا دیکھ روانی میری

متقابل:۔ ضد

مقابل:۔ حریف یعنی دوست

میرا دوست طبعاً بالکل میری ضد واقع ہوا ہے یہاں تک کہ اُس نے میری روانی دیکھی تو رُک گیا۔

"رُک گیا" کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس کا اظہار خود غالبؔ نے بھی نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ انہیں محض رُک گیا اور رواں کا تقابل کرنا تھا اور مقصود اس سے زیادہ نہ تھا۔

۶۔ قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی:۔ وزنی، بیش قیمت

میری حالت اُس سنگِ راہ کی سی ہے جسے ہر شخص ٹھکرا کر گزر جاتا ہے۔ یعنی باوجود گراں ہونے کے بھی اتنا ارزاں ہوں۔

اس شعر میں محض لفظِ گرانی سے ایہام پیدا کیا گیا ہے اور کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا۔

۷۔ گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری

بانی:۔ بانی مبانی۔

میری ہوائے شوق راہ بیتابی میں بگولے کی طرح اُڑائے لئے پھرتی ہے۔ اس شعر میں قافیہ کا استعمال کراہت سے خالی نہیں

غزل (۱۴۸)

۱۔ نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس شعر میں بے جا تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں
معشوق رقیب کی آغوش میں ہے اور یہ ایسا مکروہ منظر ہے کہ اُس کی تصویر کھینچنے کے لئے بجائے موقلم کے پائے طاؤس ہونا چاہیئے۔ (کیونکہ پائے طاؤس بہت بدنما ہوتا ہے اور تصویر کا نیچے کا حصہ (یعنی رقیب کا جسم) بھی ویسا ہی بدنُما ہے۔

۲۔ تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشہ جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تحیر کو تماشا جانے یعنی تحیر کو پسند کرے
مفہوم یہ ہے کہ میری داستانِ غم آشفتہ بیانی چاہتی ہے اور تو صرف تحیّر (سکوت کو پسند کرتا ہے، اس لئے مجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

۳۔ وہ تپِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

میں اس تپِ عشق کا متمنی ہوں جو جگر تک پہونچ کر سارے جسم کو شمع کی طرح سراسر شعلہ بنا دے۔

غزل (۱۸۵)

۱۔ گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

از بسکہ :- بہت زیادہ
گلشن کو تیری صحبت وہم نشینی حد درجہ مرغوب ہے اور اس کے ہر غنچہ کا کھل کر پھول بن جانا گویا تیرے لئے اپنی آغوش کھول دینا ہے۔

۲۔ واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

معشوق کا استغنا ہر دم بڑھتا جاتا ہے اور ادھر میرے نالہ کا دعوٰے یہ ہے کہ وہ اس کے بام استغنا تک پہونچ جاتا ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔

غزل (۱۸۶)

۱۔ سیماب پشتِ گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

پشت گرمی :- اعانت، مدد
آئینہ میں صیقل و جلا سیماب کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے اور چونکہ آئینہ کو حیران بھی کہتے ہیں اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ آئینہ کی حیرانی کا سبب سیماب ہے۔ اسی کے پیشِ نظر غالبؔ نے اپنی حیرانی کا سبب دلِ بیقرار کو ظاہر کیا ہے۔ دلِ بیقرار اور سیماب کی مشابہت ظاہر ہے)۔
اس شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ "دے" کھٹکتا ہے اور صرف وزن پورا کرنے کے لئے

لایا گیا ہے، اس کو نکال دینے کے بعد مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔

غزل (۱۸۹)

۵۔ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

غالب محبوب سے کہتا ہے کہ تم ہم سے منھ چھپا کر لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ ہماری تمھاری کوئی شناسائی نہیں ہے، حالانکہ تمھاری یہی ادا پردہ فاش کر دینے والی چیز ہے۔

جس طرح تم اور دوں سے بے تکلف ملتے ہو اسی طرح مجھ سے بھی ملو۔ خصوصیت کے ساتھ کسی سے پردہ کرنا راز فاش کر دیتا ہے۔

پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم صرف اس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ پردہ سے پردہ فاش ہونے کا مفہوم مراد ہو۔

۶۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیئے

غیر نے میرا ذکر محبوب کے سامنے چھیڑا تو وہ اُس سے بھی برہم ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں "کس قدر دشمن ہے" کا فاعل غیر نہیں بلکہ محبوب ہے۔

غزل (۱۹۰)

۱۔ ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان بڑا پُر لطف ہے۔ شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ منزل تک پہونچنے کے لئے بیابان سے گزرنا ضروری ہے اور ادھر بیاباں کا یہ حال ہے کہ میرے ہر قدم کے ساتھ وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ قطعِ بیاباں ممکن ہے اور نہ

منزل تک رسائی آسان۔

۲۔ درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

"درسِ عنوانِ تماشا" سے مراد صرف تماشا ہے۔ اگر "درس عنوان" کو حذف کر دیا جائے تو صرف لفظِ تماشا سے مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔

پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ حسنِ محبوب کے تماشہ یا دیدار کا لطف اسی میں ہے کہ محبوب اس سے بے خبر ہو۔

دوسرے مصرعہ میں نگہ کو "رشتۂ شیرازۂ مژگاں" کہنا اس حیثیت سے ہے کہ جس طرح "رشتۂ شیرازۂ مژگاں" غیر محسوس ہے اسی طرح میری نگہ بھی غیر محسوس ہے اور محبوب کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

ردیف "مجھ سے" کا استعمال "میرا" کی جگہ کیا گیا ہے جو تکلف سے خالی نہیں۔

۳۔ غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

خانۂ آئینہ کی ویرانی یہی ہے کہ اُس کے سامنے بیٹھ کر شغلِ آرائش ترک کر دیا جائے اور غمِ عشاق نے معشوق میں ترکِ آرائش کا خیال پیدا کر کے سادگی کی طرف مائل کر دیا تو خانۂ آئینہ کی ویرانی ظاہر ہے۔

پہلے مصرعہ میں "نہ ہو" کا تعلق زمانۂ مستقبل سے ہے اور دوسرے مصرعہ کا "ہے" زمانۂ حال کو ظاہر کرتا ہے، اس لئے اگر پہلے مصرعہ میں "نہ ہو" کی جگہ "ہوا" کر دیا جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے یا پھر یوں سمجھا جائے کہ غمِ عشاق کو منادیٰ قرار دیا گیا ہے اور

اس سے کہا جا رہا ہے کہ تو "بسادگی آموز بتاں" نہ بن لیکن یہ تاویل کچھ یونہی سی ہے۔

تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں غالب صرف اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے کہ میرے نہ ہونے سے اس نے سوگ لے لیا اور آئینہ کے سامنے بننا سنورنا چھوڑ دیا اور دوسرے مصرعہ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں یہ صورت عام نہ ہو جائے اور غمِ عشاق میں تمام معشوق ترکِ آرائش پر آمادہ ہو جائیں۔

۵۔ اثرِ آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں

صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اس شعر میں آبلہ کو گوہر اور جادۂ صحرا کو رشتۂ گوہر قرار دیا ہے۔ مدعا یہ کہ میرے پاؤں کے چھالوں نے پھوٹ کر تمام جادۂ صحرا کو روشن کر دیا ہے۔

غزل (۱۹۲)

۱۔ چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے

صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

گریباں کرے:۔ فارسی میں گریباں کردن، چاک کرنے کو کہتے ہیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عالمِ وحشت میں (جب کہ جسم عریاں ہو) گریباں چاک کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو صبح کے مانند خود میرا زخم دل چاک ہو جاتا ہے۔ "صبح کے مانند" اس لئے کہا کہ اُسے بھی شعراء گریباں چاک کہتے ہیں اور زخم کے پھیلاؤ کی وجہ سے اُسے بھی دامندار کہتے ہیں۔

۲۔ ہے شکستن سے بھی دل مایوس یارب کب تلک

آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

خطاب خدا سے ہے لیکن اشارہ معشوق کی سنگدلی کی طرف ہے کہ باوجود اظہارِ گرانجانی کے وہ ہمارے دل کی طرف توجہ نہیں کرتا ۔ ظاہر ہے کہ پتھر کی توجہ آبگینہ کی طرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اسے توڑ دے ۔

مدعا یہ کہ محبوب کے تغافل کا یہ عالم ہے کہ وہ ہم پر ظلم و ستم بھی روا نہیں رکھتا ۔

۴۔ میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

میکدہ کا چشمِ مستِ ناز سے شکست پانا یہی ہے کہ چشمِ یار کی نشہ بخشیاں مےکدہ سے بڑھ جائیں ۔

موئے شیشہ سے مراد وہ بال ہے جو ٹوٹے ہوئے شیشہ میں پیدا ہو جاتا ہے ۔

مژگانی کرنا یعنی مژگاں کا کام دینا ۔

مفہوم یہ ہے کہ چشمِ یار سے جو مستی و بیخودی پیدا ہو جاتی ہے وہ خُم کا خُم پی جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ بات میکدے کے لئے اتنی باعثِ شرم ہے کہ ساغر بھی اُس کو دیکھ کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں ۔

۵۔ خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

یہ خیال کہ الفت زلف کے سامنے یہ اقرار کرے کہ مجھے ہر پریشانی منظور ہے ایک حد تک تو غنیمت ہے لیکن خطِ عارض سے تحریرِ عہد نامہ کی طرف خیال منتقل ہونا کوئی قابلِ تعریف خیال نہیں ۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ سبزۂ خط کے ساتھ زلف کا ذکر کیوں کیا گیا جب کہ سبزۂ خط ظاہر ہونے کے بعد زلف کا حُسن گھٹتا ہے بڑھتا نہیں ۔ ممکن ہے غالبؔ کا

ذوق اس کے خلاف ہو۔

غزل (۱۹۴)

۱۔ تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

میری تپش کی شدت کا یہ عالم ہو کہ بستر اور تکیہ دونوں کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مدعا یہ کہ بیقراری کی حالت میں مجھے کسی کروٹ چین نہیں ملتا۔

۲۔ سرشکِ سر بصحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

"سر بصحرا اُفتادہ" یہ پورا فقرہ صفت ہے سرشک کی اور "بے دست و پا افتادہ" صفت ہے دل کی۔

صحرا سے یہاں صحرا نہیں بلکہ وسعتِ دامن مراد ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرا دامن ہر وقت آنسوؤں سے تر رہتا ہے اور دلِ ناکام بسترِ مجبوری پر پڑا رہتا ہے۔

۳۔ خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو وہ آئے ہیں
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

یہ شعر اس غزل کی جان ہے۔ محبوب کا عیادت کے لئے آنا عاشق کے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہوا کرتا ہے اور اسی خیال کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ محبوب کی آمد سے شمعِ بالیں میں بھی رونق آگئی اور بسترِ علالت کی بھی قسمت جاگ اٹھی۔

۴۔ یہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

اس شعر میں بے چینی و اضطراب کا اظہار ناگوار مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔
شامِ تنہائی کے اضطراب کو اس طرح ظاہر کرنا کہ تارِ بستر آفتابِ صبحِ محشر کی شعاع کی طرح نظر آنے لگے، بلندئ خیال ضرور ہے لیکن اُس کو جن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے اُن میں سے بعض کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔
پہلے مصرع میں طوفان گاہ اور جوش دونوں کا آفتابِ صبحِ محشر سے کوئی تعلق نہیں محض مصرع پورا کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا:۔
"نہ پوچھو مجھ سے وجہِ اضطرابِ شامِ تنہائی"

۵۔ ابھی آتی ہے بو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

بالش:۔ تکیہ
مفہوم یہ ہے کہ ہم زلیخا کی طرح اپنے محبوب کو صرف خواب میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتے کیونکہ وہ ہمارے پاس آتا ہے اور جب جاتا ہے تو اپنے بالوں کی خوشبو تکیہ پر چھوڑ جاتا ہے۔

غزل (۱۹۵)

۱۔ خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

اس شعر میں غالب نے رگِ گردن کہہ کر دو مفہوم علیحدہ علیحدہ پیدا کئے ہیں۔
"رگِ گردن" غرور و نخوت کو کہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ مفہوم بھی اس میں پنہاں ہے کہ

رگ گردن، قطع بھی کی جاتی ہے۔

مدعا یہ کہ تیری دوستی پر غرور کرنے سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مبادا تو دشمن ہو جائے اور رشتۂ الفت رگ گردن کی طرح قطع کر دے۔

غزل (۱۹۶)

۵۔ شادی سے گزر کر غم نہ ہووے اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

اردی بہار کا مہینہ ہے اور دے خزاں کا جو اس کے بعد آتا ہے

کہتا ہے کہ اگر تو غم سے بچنا چاہتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تو خوشی بھی ترک کر دے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُردی کے بعد ہی دے کا زمانہ آتا ہے یعنی اگر بہار نہ آئے تو اسکے بعد خزاں کے آنے کی بھی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔ مدعا یہ کہ اگر دنیا میں مسرت کا خیال ترک کر دیا جائے تو پھر کوئی غم۔غم نہیں رہتا۔

۷۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ

آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

اس شعر میں غالبؔ نے ردیف کا استعمال بڑی ندرت کے ساتھ کیا ہے۔ چونکہ اس زمین کی ردیف "نہیں ہے" اور ساری غزل میں نہیں ہے" نہیں ہے" کی تکرار کی گئی ہے اس لئے غالبؔ نے اپنا نام ہی "نہیں ہے" رکھ لیا اور اسی سے مخاطب ہو کر پوچھ رہا ہے کہ اے تو وہ جو ہر بات میں "نہیں ہے" "نہیں ہے" کہنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو بتا کہ تو خود کیا ہے۔

غزل (۱۹۷)

۲۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

یہ شعر انداز بیان کے لحاظ سے غالبؔ کے نشتروں میں سے ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ ایک زمانہ کے تغافل کے بعد محبوب کو اتنی توجہ ہوئی ہے کہ وہ ہم کو کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے اور وہ بھی پوری نگاہ سے نہیں۔ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ اُس کی یہی نگاہ جو بظاہر پوری نگاہ نہیں کہہ سکتے کیا چیز ہے۔ مدعا یہ کہ پہلے تو تغافل ہی تغافل تھا مگر نادانستہ۔ لیکن اب اس تغافل میں یہ احساس بھی پیدا ہو چلا ہے کہ تغافل کس سے کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ دانستہ تغافل اُسی سے کیا جاتا ہے جس سے لگاؤ ہوتا ہے۔

غزل (۱۹۸)

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں وے اُن کی تمنا نہیں کرتے

ہم تمام تکلیفیں برداشت کرتے ہیں لیکن اُن کی تمنا نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم کو برنائے رشک یہ بھی گوارا نہیں کہ ہم خود ان کی تمنا کریں چہ جائیکہ کوئی اور۔

اسی مفہوم کا شعر غالبؔ نے ایک اور لکھا ہے:۔
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غزل (۱۹۹)

۱۔ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

جب تو جام اپنے لبوں تک لے جاتا ہے تو خود شراب تیرے ہونٹوں سے کسبِ رنگ کرتی ہے اور خطِ پیالہ گلچیں کی طرح تیرے ہونٹوں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

غزل (۲۰۰)

۱۔ کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

چشمِ بتاں اگر محوِ تغافل ہیں اور وہ کسی کی طرف نہیں اٹھتیں تو غلط نہیں کیونکہ وہ بیمار ہیں اور آنکھ کی بیماری میں، دیکھنے اور نگاہ سے کام لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

غزل (۲۰۱)

۱۔ دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

اگر نامہ بر ہمارے محبوب کو دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھا اور ہمارا رقیب ہو گیا تو کیا کیا جائے وہ بھی آخر انسان ہے علاوہ اس کے اس لحاظ سے بھی کہ وہ ہمارا نامہ بر ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

یہ ہم جانتے ہیں کہ قضا ایک نہ ایک دن ضرور آکر رہے گی۔ لیکن اس کا بھی یقین ہے کہ آج نہ آئے گی۔ مدعا یہ کہ آج آجاتی تو ہماری تکلیفوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن وہ بربنائے ضد کیوں آنے لگی۔

۶۔ تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ سررشتۂ وفا ہمارے ہی ہاتھ میں ہے لیکن تم اُس سے اس قدر بے خبر ہو کہ یہ بتانے کے بعد بھی اگر میں تم سے پوچھوں کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے تو تم نہ بتا سکو گے۔

غزل (۲۰۲)

۱۔ دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

دامن افشانی :۔ ترکِ علائق
ترکِ علائق کے سلسلہ میں، میں نے کپڑے تو اُتار پھینکے لیکن آزادی مجھے پھر بھی نصیب نہ ہوئی اور تن کی وابستگی بدستور قائم رہی۔ مدعا یہ کہ حقیقی آزادی اس زندگی میں کسی کو نصیب نہیں۔

۲۔ بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

سنگ فساں :۔ وہ پتھر جس پر تلوار تیز کی جاتی ہے۔
لفظ "گراں" سے فائدہ اُٹھا کر گرانجانی کو سنگِ فساں قرار دیا گیا جس پر تیغِ نگاہِ یار تیز کی جاتی ہے۔

۳۔ کیوں نہ ہو بے التفاتی، اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

"پرسش ہائے پنہانی" فارسی میں لفظ پرسش ہمیشہ عیادت و تعزیت کے معنی میں استعمال

ہوتا ہے اور "پرسشِ حال" کے لئے جب اُس کا استعمال کیا جائے گا تو لفظ حال کا اظہار ضروری ہوگا۔ غالب نے یہاں اُس کا کنائی استعمال کرکے پرسشِ حال کا مفہوم پیدا کیا ہے۔

پرسشہائے پنہانی:۔ سے وہ آگاہی مراد ہے جو پوشیدہ طور پر یا چھپ کر حاصل کی جائے۔

مفہوم یہ ہے کہ محبوب جانتا ہے کہ میں اُس سے بے خبر نہیں ہوں اور کسی نہ کسی طرح خواہ وہ تصور ہی کی مدد سے کیوں نہ ہو اس تک پہنچ جاتا ہوں۔ اس لئے وہ مطمئن ہے اور التفات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

۵۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر۔ نہ ہوتا کاشکے

اِس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

"مرغ بستانی" سے مراد بلبل ہے۔

نوائے بلبل سننے کا شوق مجھے بار بار چمن کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ وہ بھی میری طرح زاری و نالی میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن میرا محبوب یہ دیکھ کر مجھ سے بدگماں ہوتا ہے لیکن کیوں؟ اس کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب یہ خیال کرتا ہو کہ غالبؔ کو صرف سیرِ چمن کا شوق ہے اگر اسے میری محبت ہوتی تو وہ صحرا کا رُخ کرتا کسی گلشن کی طرف کیوں جاتا۔

غزل (۲۰۳)

۱۔ یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

یارب:۔ فریاد

سبحہ:۔ سمرن، تسبیح۔

میرا یہ عالم ہے کہ مسرت میں بھی ہنگامۂ فریاد جاری رہتا ہے اس لئے جب زاہد کو تسبیح خوانی میں مصروف دیکھتا ہوں تو میں مسکرا پڑتا ہوں اور مجھے اپنا عالمِ فریاد یاد آجاتا ہے۔ اس میں زاہد پر ہلکا سا طنز بھی شامل ہے۔

۲۔ ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

قفلِ ابجد :۔ ایک خاص ترکیب کا قفل جو بعض مخصوص حروف کے مل جانے پر کھلتا ہے۔

جس طرح قفلِ ابجد بغیر لفظ بنائے ہوئے نہیں کھل سکتا اسی طرح میری دل گرفتگی بھی اُس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک میں فکرِ سخن نہ کروں۔

۳۔ یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

جب میں زنداں میں تھا تو صحرا نوردی کے لئے بیتاب تھا اور اب صحرا نوردی کے زمانہ میں مجھے زندانیوں کی آسائش پر رشک آتا ہے۔ مدعا یہ کہ نہ مجھے زنداں میں چین ہے نہ صحرا نوردی میں۔

۴۔ طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھے حسرت و ناکامی ہی میں لطف آتا ہے اس لئے میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ آرزو پوری نہ ہو اور میں مبتلائے حسرت رہوں۔

غزل (۲۰۴)

۲۔ قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس و فرہاد کی آزمائش قد و گیسو سے آگے نہیں بڑھتی لیکن میں عشق کی جس منزل سے گزر رہا ہوں وہاں دار و رسن سے آزمائش ہوتی ہے۔

مدعا یہ کہ میرا مرتبۂ عاشقی قیس و فرہاد سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

۳۔ کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

فرہاد کو بے ستون کھود کر جوئے شیر لانے کی فرمائش تو صرف اس کی جسمانی قوت کی آزمائش ہے۔ آگے بڑھ کر اس کو ایک اور سخت امتحان دینا ہے جس کا تعلق اس کے حوصلہ سے ہے۔ مگر وہ امتحان کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کی مراد اس سے یہ ہو کہ اسے مرگ شیریں کی خبر سنائی جائے گی اور وہ یہ خبر سن کر تیشہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گا۔

۴۔ نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

پیرِ کنعاں سے مراد حضرت یعقوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فراقِ یوسف میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی لیکن پیرہنِ یوسف کی خوشبو آئی تو وہ عود کر آئی۔

مفہوم یہ ہے کہ نسیم مصر اگر یوسف کی بوئے پیرہن کو یعقوب تک لے گئی تو اس سے مقصود یعقوب کی ہمدردی نہ تھی بلکہ صرف یہ دیکھنا تھا کہ "یوسف کی بوئے پیراہن" کتنا زبردست

اثر اپنے اندر رکھتی ہے۔

۷۔ نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

تسبیح و زنار میں بجائے خود کوئی دلکشی یا کشش نہیں کہ شیخ و برہمن اُس کے غلام بنے رہیں۔ بلکہ اس سے اصل مقصود اُن کی وفاداری کا امتحان ہے کہ آیا جو کیش و مسلک انھوں نے اختیار کر لیا ہے۔ اُس پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔

۸۔ پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

مگر:۔ شاید

دل سے خطاب ہے کہ تو اس سے پہلے بھی زُلفِ یار کی بندش سے آزاد ہونے کی کوشش کر چکا ہے اور ناکام رہا ہے اس لئے اب کیوں بیتاب ہے کیا پھر اس زلفِ پُرشکن کی طاقت آزمانا چاہتا ہے۔

غزل (۲۰۶)

۱۔ زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ، سیلیٔ ندامت ہے

چونکہ حسن کا بار بار تماشا کرنا، سراسر دیوانگی ہے اس لئے وقتِ تماشا میری پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا گویا ایسا ہے جیسے شرم و ندامت مجھے تھپڑ مار رہی ہو۔ مدعا یہ

ظاہر کرنا ہے کہ تماشائے حُسن کا نتیجہ ندامت کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

اغیار سے ملنے کے لئے معشوق آئینہ کے سامنے محوِ آرائش ہے، لیکن یہ بھی سوچتا جاتا ہے کہ میرا ایسا کرنا غالب سے بدعہدی ہوگی اور اس خیال کے زیرِ اثر وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ آئینہ بھی اس کو ملامت کر رہا ہے۔

۳۔ بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

امن و عافیت اسی میں ہے کہ حرص و ہوس کو چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

باوجود اس کے کہ اغیار کا دعوائے عشق بے بنیاد ہے لیکن تو پھر بھی دفا پر آمادہ ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص جنون و دیوانگی کی مصنوعی کیفیت اپنے اوپر طاری کرے اور فصلِ گل سے لطف حاصل کرے۔

غزل (۲۰۸)

۴۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے آگے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

جب میں صحرا میں خاک اُڑانے پر آجاتا ہوں تو خود صحرا اپنی گرد میں چھپ جاتا ہے اور
جب اشکباری شروع کر دیتا ہوں تو دریا بھی مجھ سے عاجز آجاتا ہے۔

۱۱۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

شبِ ہجراں میں ہم موت کی تمنا کرتے تھے لیکن موت نہ آئی۔ اب شبِ وصل میں یہ تمنّا
شادیٔ مرگ سے پوری ہوئی۔

غزل (۲۰۹)

۸۔ رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

اس شعر میں اور اس سے پہلے کے چند اشعار میں زمانہ کے نامساعد حالات کا ذکر کرتے
ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ زمانہ کا چلن کتنا اُلٹا ہو گیا ہے۔ ظلم کی داد کہیں نہیں ملتی یہاں تک کہ
اگر قاتل جان لے تو اُس سے خونبہا لینے کی جگہ اُلٹا خونبہا دینا پڑتا ہے اور زبان کاٹنے والے
کو مرحبا و آفرین کہنا پڑتی ہے۔

غزل (۲۱۰)

۱۔ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھوئے گئے = بے شرم و حجاب ہو گئے۔
ہم نے محبت میں اشکباری سے اس لئے کام نہیں لیا تھا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو لیکن

آخر کار جب ضبط باقی نہ رہا اور آنسو جاری ہو گئے تو یہ ساری احتیاط خاک میں مل گئی اور ساری دنیا پر یہ راز ظاہر ہو گیا۔

غزل (۲۱۱)

۱۔ نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبز جو بارِ نغمہ ہے

غالبؔ نے اس شعر میں محفلِ طرب کی مسرت و نشاط کا ذکر کیا ہے کہ ہر شخص نشہ میں چور ہے مطربوں کے ساز سے مستی ٹپک رہی ہے، شیشۂ شراب سروِ سبز نظر آتا ہے اور نغمہ جو بار کی طرح جاری ہے۔

۲۔ ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

اگر میں دوست کی محفلِ عیش و مسرت میں نالہ کرتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بزمِ محبوب میں کوئی تلخی یا برہمی پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہاں تو میرے نالہ سے بھی نغمہ کا سا لطف اٹھایا جاتا ہے۔

غزل (۲۱۲)

۱۔ عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

جب معشوق ازراہِ شوخی ہنستا ہے تو اس کے دانت نمایاں ہو جاتے ہیں، اسی طرح احباب کا یکجا ہو جانا بھی ہنسی کی بات ہے کیونکہ اس جمعیت کا کیا اعتبار۔

اس شعر میں محبوب کے دانتوں کو ایک دوسرے سے ملے ہوئے دیکھ کر جمعیتِ احباب کی طرف خیال منتقل ہوا۔

۲۔ ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجام گل
یک جہاں زانو تامّل در قفائے خندہ ہے

یک جہاں زانو تامّل: تامّل بسیار۔ کیونکہ فکر کے وقت انسان زیادہ تر زانو پر سر رکھ کر سوچتا ہے۔
مفہوم یہ ہے کہ غنچہ ہنوز حالتِ عدم میں ہے لیکن وہ سوچ رہا ہے کہ اُس کا انجام یہی ہونا ہے کہ وہ غنچہ سے پھول بنے اور آخر کار فنا ہو جائے جو بڑی عبرت کی بات ہے۔

۳۔ کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

عیشِ بیتابی: وہ لطف جو بیتابی سے حاصل ہو۔
دنداں در دل افشردن: تکلیف و مصیبت کو برداشت کرنا
افسردگی کے عالم میں ہم بیتابی کا اظہار حرام سمجھتے ہیں ورنہ تکلیفوں کے تحمل کے لئے اگر ہم اپنے دل کو دانتوں سے زخمی کر دیں تو اس سے ایک کیفیت خندہ ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔
اس شعر میں فارسی محاورہ " دنداں در دل افشردن " سے ایہام پیدا کر کے انتہائی دور از کار استعارہ سے کام لیا گیا

۴۔ سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بظاہر احباب یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں سوزشِ باطن نہیں پائی جاتی۔ لیکن اُن کا خیال صحیح نہیں۔ بظاہر میرے لب آشنائے خندہ نظر آتے ہیں لیکن دِل پر سیل گریہ طاری ہے۔

غزل (۲۱۳)

۱۔ حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

خریدارِ متاعِ جلوہ :۔ جلوہ کا خواہشمند

حسن بظاہر بے پروا نظر آتا ہے لیکن نت نئے جلوؤں کی فکر سے غافل نہیں اور ہر وقت آئینہ کے سامنے اسی فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ کس آرائش سے کام لے کر اپنے جلوؤں کو فروغ دے۔

آئینہ کو "زانوئے فکر" اس لئے کہا کہ جس طرح فکر کے وقت زانو پر سر رکھ کر سوچتے ہیں اسی طرح وہ جلوؤں کی افزائش کے لئے آئینہ سامنے رکھ کر غور کرتا رہتا ہے۔

۲۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن!
چشمِ وا گر دیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

رنگِ تماشا باختن :۔ مصروفِ تماشا رہنا۔

اے آگاہی تو کب تک جلوۂ ظاہر کے تماشہ میں مصروف رہے گی، حالانکہ اس تماشہ کے لئے آنکھ کا کھلنا ہی وداعِ جلوہ ہے یعنی آنکھ جتنی زیادہ کھلے گی، اُتنی ہی زیادہ یہ حقیقت واضح ہو گی کہ دنیا کے ظاہری جلوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

غزل (۲۱۴)

۲۔ عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

دنیا کو طرۂ لیلیٰ کے نقطۂ نظر سے کب تک دیکھا جا سکتا ہے جب کہ وہ دراصل وحشتِ مجنوں کی غبار انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔
مدعا یہ کہ دنیا میں ناکامیٔ وحشت ہی اصل چیز ہے اور ظاہری نمود و نمائش بالکل بے بنیاد چیز ہے۔

۸۔ ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

"سودائے جنوں" نقصان کا سودا نہیں کیونکہ اس عالم میں ہر سنگ و خشت جس سے لڑکے دیوانوں کو مارتے ہیں اُس کے لئے صدف کا حکم رکھتا ہے اور یہ شکست دیوانوں کو گوہر کی طرح عزیز ہے۔ جس سے گوہرِ شکست حاصل ہوتا ہے۔

۱۰۔ ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

یاس: نومیدی۔ ایک پھول کا نام بھی ہے۔
طبعِ ایجاد پسند کی وحشت کا نتیجہ ہمیشہ یاس و نومیدی ہوا کرتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کا درد نومیدی میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہے۔

غزل (۲۱۷)

۲۔ جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

جس طرح تلوار میں جوہر پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ تیزاب (زہرآب) سے کام لیا جاتا ہے اُسی طرح میری حالت بھی اُس سبزہ کی ہے جو زہرآب سے نشو و نما پاتا ہے۔ مدعا یہ کہ میری فطرت ہی یہ ہے کہ زہرِ غم سے آسودہ ہو۔

۲۔ مدّعا، محوِ تماشائے شکستِ دل ہے

آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

ہمارا مدعا یہی تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہم شکستِ دل کے تماشہ میں محو ہو جائیں چنانچہ اب ہماری حالت ایسی ہے جیسے کسی کو آئینہ خانہ میں لے جائیں اور ہر طرف اُسے اپنی ہی صورت نظر آئے۔

۴۔ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک

آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

قمری بھی خاکی رنگ کی ہوتی ہے اور قمری کا انڈا بھی خاکستری ہوتا ہے اس لئے آسمان کو بیضۂ قمری قرار دیا اور عالم کو کفِ خاک۔ چونکہ دنیا نام نالہ وزاری اور خاک اُڑانے کا ہے اس لئے آسمان گویا بیضۂ قمری ہے (جو خاکی رنگ کا ہوتا ہے) قمری کی آواز کو بھی نالہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل (۲۲۰)

۱۔ کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

اگر ہم صدا یا آواز بن کر اس دنیا میں رہنا چاہیں بھی تو صدائے بازگشت کی طرح پہاڑ اسے لوٹا دیتا ہے۔ اس لئے پوچھتا ہے کہ شرارِ جستہ بتائے ہمیں کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال میں جواب بھی پنہاں ہے اور وہ یہ کہ شرارِ جستہ ہو جانا ہی زیادہ موزوں ہے کہ دفعتہً نمودار ہوتا ہے اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔

غزل (۲۲۱)

۱۔ مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژہ خوابناک ہے

مستی میں غفلت ہوتی ہے لیکن ساقی کی ادائے غفلت پر وہ بھی نثار ہے۔ یہاں تک کہ جس چیز کو ہم موجِ شراب کہتے ہیں وہ محبوب کی مژہ خوابناک سے زیادہ نہیں۔ مدعا صرف محبوب یا ساقی کی غفلت شعاری کا اظہار ہے جس کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ جُز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

میرے دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں کہ تیری تیغِ ناز اُس کو زخمی کرے اور آرزو کا تعلق چونکہ خیال سے ہے اس لئے گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ تیرے ہاتھوں جیبِ خیال بھی چاک چاک ہے۔

۳۔ جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں ایک مشتِ خاک ہے

جوشِ جنوں کا یہ عالم ہے کہ ہمیں دنیا میں صحرا نوردی کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی باقی نہیں رہی۔ گویا صحرا نے ہماری آنکھ میں خاک جھونک دی ہے اور اب دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا۔

غزل (۲۲۳)

۱۔ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

عیسیٰ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ صرف جنبشِ لب سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے لیکن وہ لوگ جو لعلِ بتاں کے کشتہ ہیں اُن پر عیسیٰ کی مسیحائی گہوارہ جنبانی کا کام کرتی ہے اور ان کی نیند اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ مدعا یہ کہ جو عشاق معشوق کے لبِ لعلیں کے کشتہ ہیں اُن کا چارہ مسیح کے پاس بھی نہیں۔

غزل (۲۲۴)

۱۔ میں بھی ہوں تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

میرا کسی بات کی تمنّا کرنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ پوری بھی ہو بلکہ میرا مقصود تو نیرنگِ تمنّا کا تماشہ دیکھنا ہے یعنی صرف یہ دیکھنا کہ انسان کیسی کیسی آرزوئیں کرتا ہے اور وہ کس کس طرح ناکام رہتی ہے۔

غزل (۲۲۵)

۱۔ سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہی شبہائے ہجراں کی

تصویر دل کے ذریعہ سے بھی اظہارِ حقیقت کیا جاتا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر غالب نے ظاہر کیا ہے کہ میری لوحِ تقدیر میں شبِ ہجراں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بالکل ایسی ہے جیسے کاغذ پر سیاہی کا دھبہ پڑ جائے۔

غزل (۲۲۶)

۱۔ ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرض یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

"خس بدنداں" ہونے سے اظہارِ عجز مراد ہے کبھی زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جب دو فریق میں لڑائی ہو جاتی تھی اور اُن میں سے کوئی ایک اظہارِ عجز کرتا تھا تو اُس کا سردار فاتح یا غالب فریق کے سامنے دانت میں تنکا دبا کر آجاتا تھا۔ حیرت عاجز (عاجز حیرت) ترکیب مقلوب ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہجومِ نالہ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں آہ و فغاں سے باز رہتا ہوں۔

اس حالت کو اُس نے دوسرے مصرعہ میں بڑی پاکیزہ تشبیہہ سے ظاہر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہ یہی حالت ہے یعنی باوجود اس کے کہ اس میں بے شمار بانسریوں کے بننے کا سامان موجود ہے لیکن وہ بھی حیرت سے خس بدنداں نظر آتا ہے اور اس پر خموشی کا عالم طاری ہے۔ (بانس میں ریشے ہوتے ہیں اور اسی رعایت سے "خس بدنداں" استعمال کیا گیا ہے)

۲۔ تکلف برطرف، ہے جاں تاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجاب ناز۔ تیغِ تیز عریاں ہے

جاں تاں تر:۔ زیادہ جان لیوا۔
بدخویاں سے مراد محض معشوق ہیں۔
مدعا یہ کہ معشوقوں کا لطف اور زیادہ جان لیوا ہے کیونکہ از راہِ لطف جب وہ بے حجابانہ نگاہِ ناز صرف کرتے ہیں تو وہ تیغِ تیز ثابت ہوتی ہے۔

۴۔ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

متاعِ دست گرداں:۔ اُس شے کو کہتے ہیں جو عاریتاً حاصل کی جائے لیکن غالب نے اس کا استعمال اس معنی میں نہیں کیا بلکہ نقد سودا کے مفہوم میں کیا ہے اور ساغر چونکہ دست بدست چلتا ہے اس لئے اُس نے دستگرداں کا لفظ استعمال کیا جو یقیناً بڑا لطیف استعمال ہے۔
شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی سے سودا کرنا ہے تو یہاں عاریت سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے دل و دین پیش کرنا ضروری ہے۔

۵۔ غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

قلزم:۔ سمندر
صرصر:۔ تیز و تند ہوا
مرجاں:۔ مونگا
مونگا سُرخ ہوتا ہے اور سمندر میں پایا جاتا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر غالب کہتا ہے کہ جس طرح سمندر میں مرجاں کا چراغ روشن ہے اُسی طرح غمِ عشق آغوشِ بلا میں عاشق کی پرورش کرتا ہے اور ہمارا وجود ایسا ہے جیسے بادِ صرصر میں کوئی چراغ روشن ہو۔ ہجومِ بلا کو "قلزمِ صرصر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

غزل (۲۲۷)

۱۔ خموشیوں میں تماشہ ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

"تماشا ادا" کو اگر ترکیبِ توصیفی قرار دیا جائے تو اُس کو نگاہ کی صفت قرار دیا جائیگا یعنی "نگاہ تماشا ادا" جس کا مفہوم ہوگا "نگاہ قابلِ تماشا" اور نکلتی ہے کا فاعل نگاہ ہوگی لیکن اگر نکلتی ہے کا فاعل ادا کو قرار دیا جائے تو پھر پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ خموشیوں میں تیری ادا قابلِ تماشہ ہو جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ غالب اس شعر میں معشوق کی نگاہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اُس کی خاموشی کے لُطف کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اُس کا اظہار یوں کرتا ہے کہ تیری خاموشی گویا دل سے نکلی ہوئی نگاہ سرمہ سا ہے اور نگاہِ سرمہ آلود ہی کا سا لطف دیتی ہے۔

۲۔ فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فشار : بھینچنا۔

اس شعر میں غالب نے شبنم کے وجود کی بڑی پیاری توجیہہ کی ہے۔ کہتا ہے کہ غنچہ پر شبنم کے جو قطرے نظر آتے ہیں وہ در اصل صبا ہے جو غنچہ کی تنگیِ خلوت سے پانی ہوگئی ہے۔

۳۔ نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخم روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

اس شعر میں غالبؔ نے تیغِ نگاہ کی آبداری اور تیزی کا ذکر کیا ہے کہ سینۂ عاشق سے تیغِ نگاہ کی کاٹ کا حال نہ پوچھو بلکہ سینہ کے زخم کو دیکھو جس میں روزنِ در کی طرح ایک بڑا روزن پیدا ہو گیا ہے اور اس سے برابر ہوا نکلتی رہتی ہے۔

جب سینہ کا زخم ہوا دینے لگتا ہے تو اسے مہلک سمجھا جاتا ہے (زخم سینہ کو اس وقت ہوا دینے والا کہتے ہیں۔ جب پھیپھڑے کی ہوا جو ناک اور منھ سے نکلتی ہے سینہ کے زخم سے نکلنے لگے۔)

غزل (۲۲۸)

۱۔ جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

اس شعر میں غالبؔ نے زلفِ یار کی خوشبو کا ذکر کیا ہے کہ جب ہوا زلفِ یار کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے تو دماغِ آہو بھی نافہ کی طرح معطر ہو جاتا ہے۔

۲۔ کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ ششش جہتِ انتظار ہے

شش جہت :- یعنی تمام عالم یا جملہ کائنات۔

اس شعر میں خیال اور الفاظ سب بیدلؔ کے ہیں۔ انسان کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ "یہ جلوہ گری کس کی ہے" اور اس انتہائی حیرت کو "آئینہ فرشِ شش جہت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۔ ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے شوق کی وسعت و فراوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ میرے غبارِ شوق کو تنگیٔ جا کے فشار نے ذرہ ذرہ کر دیا ہے اور ان ذروں نے ایک ایسی جال کی سی صورت اختیار کر لی ہے جس نے وسعتِ صحرا کو بھی اپنے اندر لے لیا ہے۔

۵۔ چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ایران میں رسم ہے کہ جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو چلتے وقت اس کی پشت کی طرف آئینہ رکھ کر پانی چھڑکتے ہیں اور اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ اس کا سفر خیریت سے ختم ہو گا۔ اور عافیت کے ساتھ گھر لوٹ آئے گا۔

اسی رسم کے پیشِ نظر غالبؔ عندلیب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ گلشن میں شبنم نہیں ہے بلکہ آئینہ برگِ گل پر پانی چھڑکا گیا ہے اور اس طرح بہار کو رخصت کیا جا رہا ہے تاکہ وہ پھر جلد واپس آئے۔

۸۔ اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

عندلیب سے خطاب ہے کہ اپنے آشیاں کے لئے ابھی سے تنکے جمع کرے ورنہ جب بہار آجائے گی تو پھر خشک تنکے کہاں ملیں گے۔

۹۔ دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بیدماغ آئینہ تمثال دار ہے

بیدماغ:۔ نافہم

خبر:۔ معرفت حقیقت

اپنے سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے نافہم اگر دل حقیقت معرفت سے بے خبر ہے تو بھی اُس کو برباد نہ کر کیونکہ اگر یہ حقیقت کا آئینہ دار نہیں تو کم از کم اس میں کچھ تصویریں تو ایسی نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم کچھ دیر لطفِ تماشا حاصل کر سکتے ہیں۔

غزل (۲۲۹)

۱۔ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شعر کا مفہوم صاف ہے کہ تجھ سا حسین دنیا میں کوئی نہیں اور اگر یہ سوال کبھی پیدا ہو تو اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تیرے سامنے آئینہ لاکر رکھ دوں۔ مدعا یہ کہ تو آپ اپنی مثال ہے اور دنیا میں کوئی دوسرا تیرا مقابل نہیں۔

اس شعر میں "تماشا کہیں جسے" کا استعمال سمجھ میں نہیں آتا۔ فارسی میں لفظ تماشا دو معنی میں مستعمل ہے نظارہ اور ہنگامہ اور ان دونوں معنی میں اس لفظ کا استعمال محذوف ہے صرف "تجھے" ہو سکتا ہے۔ اس لئے اگر پہلے مصرعہ کا مفہوم کچھ اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ آئینہ کیوں نہ دوں کہ (تو) تماشہ کرے جسے۔ "تو تماشہ کا صحیح مفہوم پیدا ہو سکتا۔"

۲۔ حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں

گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

بزمِ خیال سے مراد دل ہے ۔ مدعا یہ کہ لوگ جسے "سویدائے دل" کہتے ہیں وہ دراصل گذرنہ ہے ہماری حسرت آلود نگاہوں کا۔ یعنی ناکامی نظارہ نے ہمارے دل کو داغدار بنا دیا ہے ۔

۴۔ سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے

وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

دردِ غریبی و کس مپرسی کا ہجوم دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ خاک بسر ہو جائیے اور صحرا نوردی اختیار کر لیجئے ۔

۵۔ ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں

شوقِ عناں گسیختہ ، دریا کہیں جسے

شوقِ عناں گسیختہ :۔ شوقِ بے اختیار ۔

شعر کا مفہوم صاف ہے ۔ یعنی حسرتِ دیدار سے ہماری چشمِ تر میں شوقِ بے اختیار کا دریا چھپا ہوا ہے ۔

۶۔ درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو

صبحِ بہار ، پنبۂ مینا کہیں جسے

تمام پھول عموماً صبح کے وقت کھلتے ہیں لیکن گلہائے عیش و نشاط کے کھلنے کے لئے وہ صبحِ بہار درکار ہے جسے ہم پنبۂ مینا کہہ سکیں "پنبۂ مینا" کنایہ ہے شراب کی طرف ۔ مدعا یہ ہے کہ جب تک صبوحی (صبح کی شراب) فراہم نہ ہو صحیح معنی میں لطف و مسرت حاصل ہونا ممکن نہیں ۔

غزل (۲۳۰)

۱۔ شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

نظر گاہ فارسی میں اولیائے کرام کے آستانہ اور بادشاہوں کے ایوانِ بارگاہ کو کہتے ہیں لیکن ترکیب اضافی کے ساتھ اس کے معنی بدلتے رہتے ہیں مثلاً "نظر گاہ گریباں" اُس چاک گریباں کو کہتے ہیں جس سے سینہ کا کوئی حصہ نظر آئے۔ اس لئے "نظر گاہ" کے معنی اُس جگہ کے ہوئے جہاں نگاہ جاکر ٹھہرے اور "نظر گاہِ حیا" وہ جگہ ہوئی جو باعثِ حیا ہو۔
شعر کا مفہوم یہ ہے کہ لالہ پر شبنم کا پایا جانا خالی از ادا نہیں ہے۔ لالہ دل کا سا داغ تو رکھتا ہے لیکن درد نہیں رکھتا اور یہ کیفیت اُس کے لئے باعث شرم ہے، اس لیے جس چیز کو شبنم کہا جاتا ہے وہ شبنم نہیں ہے بلکہ لالہ کا شرم سے عرق عرق ہو جانا ہے۔

۲۔ دل خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار ہے
آئینہ بدستِ بتِ بدمست حنا ہے

اس شعر کی ترکیب میں اگر پہلے مصرعہ کو مبتدا اور دوسرے مصرعہ کو خبر قرار دیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا دل جو حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اُس بدمستِ حنا کے ہاتھ کا آئینہ ہے۔ یعنی جس طرح آئینہ میں حنا کی سرخی نظر آتی ہے اُسی طرح ہمارا خوں شدہ دل نظر آتا ہے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر دونوں مصرعے اپنا اپنا مفہوم جُدا رکھتے ہوں اور مدعا یہ کہنا ہو کہ ادھر تو یہ عالم ہے کہ دل حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اور اُدھر یہ عالم ہے کہ ہر وقت اُس بدمستِ حنا کے ہاتھ میں آئینہ رہتا ہے اور ہمارے حال کی اُسے خبر نہیں۔

۳۔ شعلہ سے نہ ہوتی۔ ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی۔ کیا نہ ہوتی؟ تکلیف! (جو یہاں محذوف ہے) ہوس آرزو کو کہتے ہیں اور شعلہ سے مراد شعلۂ عشق ہے۔

شعر کا مفہوم صاف ہے۔ یعنی اگر آرزوئے عشق کی جگہ واقعی شعلۂ عشق ہمارے اندر پایا جاتا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی کیونکہ ہم جل کر کبھی کے خاک ہو گئے ہوتے۔ لیکن چونکہ دل کی افسردگی یہ کیفیت پیدا ہونے نہیں دیتی اور عشق کی آرزو میں دن کٹ رہے ہیں اس لئے اس خیال سے ہر وقت جی جلتا رہتا ہے۔

۴۔ تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق
آئینہ بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے

تیرے عکس میں وہ شوخی ہے کہ آئینہ کی آغوش ہر وقت اُس کے لئے کھلی رہتی ہے لیکن لفظِ شوخی سے شعر میں کوئی کام نہیں لیا گیا اور اُس کے استعمال کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ سوا اس کے کہ شوخی کا مفہوم محض حُسن قرار دیا جائے۔

۵۔ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

غالب نے بقول خود اے بہ معنی جُز (بہ معنی سوا) استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس معنی میں اے کا استعمال کسی نے نہیں کیا اور یہ غالب کی اختراع ہے۔

مفہوم یہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ عشق کی جگر سوختگی کا نتیجہ نالہ کے سوا کچھ نہیں اور اس کی مثال میں قمری اور بلبل کو پیش کیا ہے کہ ان میں سے ایک محض کفِ خاکستر ہو کر رہ گئی ہے

اور دوسری محض "قفسِ رنگ"۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کہنا یہی چاہتا تھا لیکن مصرعۂ اول اس مفہوم پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتا۔

قمری کو تو خیر اس کے رنگ کے لحاظ سے کفِ خاکستر کہہ سکتے ہیں لیکن بلبل کو "قفسِ رنگ" کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ بلبل مٹیالے رنگ کا طائر ہے اور اس میں نام کو بھی کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔

ہندوستان میں گلدم کو بھی بلبل کہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ غالب کے سامنے گلدم ہی رہی ہو حالانکہ اس کی بھی صرف دُم سُرخ ہوتی ہے اور سارا جسم سیاہی مائل ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بلبل کو "قفسِ رنگ" کہنا اس کے رنگِ جسم کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس نے اپنے اندر پھولوں کے رنگ کو بند کر لیا ہے تو بھی اس کو "قفسِ رنگ کہہ کر وہ بات کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے جو قمری کو کفِ خاکستر کہنے سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ قمری کا کفِ خاکستر ہونا تو سامنے کی کھلی ہوئی چیز ہے اور قفسِ رنگ ہونا متعلق ہے کیفیت سے نہ کہ ظاہری صورت سے۔ پھر کسی چیز کے "خاکستر" ہو جانے کے بعد تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کوئی نشان باقی نہیں اور قمری چونکہ صورتاً کفِ خاکستر ہے اس لئے اس کے بابت یہ کہنا کہ اس کا نشان نالہ کے سوا کچھ نہیں درست ہو سکتا ہے لیکن بلبل کو "قفسِ رنگ" کہہ کر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا نشان صرف نالہ رہ گیا ہے۔

۶۔ خوں نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

معشوق کے بے حوصلہ ہونے سے مراد یہاں اس کی بے پروائی ہے۔

۷۔ مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت

دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

دست تہ سنگ آمدن = مجبور ہو جانا

مفہوم یہ ہے کہ ہمارا یہ کہنا کہ ہم خود گرفتارِ الفت ہوئے صحیح نہیں کیونکہ ہم تو محبت کرنے پر مجبور تھے اور ہمارا ایمانِ وفا سراسر مجبوری تھا۔

۸۔ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ

تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے

تیری تیغِ ستم گویا ایک آئینہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے تو اور کتنوں کا خون کر چکا ہے۔

غزل (۲۳۱)

۱۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

تجلیِ نور ظاہر ہونے کے لئے بیتاب تھی لیکن اُس کی کوئی موزوں صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر کار اُس کی قسمت کھلی اور تیرا قد و رخ نظر آگیا اور اُنھیں کو اُس نے اپنے ظہور کا ذریعہ قرار دیا۔ مدعا یہ کہ تیرا قد و رُخ سراپا تجلی نور ہے۔

غزل (۲۳۲)

۴۔ کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

زہد میں اگر ریا شامل نہ ہو تو کچھ نہیں کیونکہ زُہدِ بے ریا میں یہ خیال تو ضرور

شامل ہوتا ہے کہ اس کا عوض بہت اچھا ملے گا اور اس طمع پیدا ہو جانے کی وجہ سے زہد و عبادت کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔

غزل (۲۳۴)

۴۔ رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

اس رشک نے کہ تیری ادا ساری دنیا کے لئے بلائے جاں ہے مجھے مبتلائے رشک رکھا کاش کہ وہ صرف میرے لئے ہوتی۔